بسم الله الرحمن الرحيم

وہ مسیحا نَفَس

شہید محمد بروجردی کی زندگی کے یادگار لمحات

ترجمہ و ترتیب

سید سُلیم مرتضی رضوی

نام کتاب: **وہ مسیحا نفَس**

ترجمہ و ترتیب: **سید سُلیم مرتضیٰ رضوی**

طبع اول: **۲۰۱۳**

ناشر: **موزہ دفاع مقدس و ترویج فرہنگ مقاومت، تہران**

فہرست

تعارف

1954 کی بات ہے شہر بروجرد کے نزدیک بسے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک بچے نے آنکھ کھولی جس کی تقدیر دست قدرت نے بڑے انوکھے انداز میں لکھی تھی۔ اگرچہ اسکی قسمت دنیا کے درد و غم سے عبارت تھی مگر اس نے اپنی زندگی کے ایک ایک پل کو اپنی بے مثل سوجھ بوجھ اور لازوال ایثار و قربانی کے نمونوں سے ایسا سجایا تھا کہ جس پر مقدر کے سکندر بھی انگشت بہ دنداں تھے۔ چھ سال کی عمر میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ معاشی بدحالی نے ماں، بھائی اور بہنوں کے ساتھ تہران کی بے وطنی پر مجبور کر دیا۔ جنوب تہران کے ایک چھوٹے سے محلے میں ایک چھوٹا سا گھر کرایہ پر لیا گیا جہاں انہیں جیسے غربت و افلاس کے مارے زندگی کا بھاری بوجھ ڈھوتے تھے۔ محمد نے اپنی چھوٹی عمر سے ہی کام کاج شروع کر دیا تھا لیکن ابتدائی تعلیم کا بھی دامن ہاتھوں سے نہ چھوڑا۔ "مولوی روڈ" پر کرایہ کے اس ایک کمرے کے چھوٹے سے گھر میں ان کی جفاکش ماں اپنی پانچوں بچوں کے ساتھ زندہ رہنے کے لئے بڑی جاں فشانی کرتی تھیں محمد کا بچپن بڑی سختی میں گزرا اور اب وہ نوجوانی کی دہلیز چھو رہے تھے۔ ان میں صبر اور حالات سے سمجھوتا کرنے کی بہت بڑی صلاحیت پیدا ہو چکی تھی۔ انہوں نے نہ تو مدرسہ چھوڑا تھا اور نہ ہی کام وہ پوری لگن کے ساتھ دونوں فرائض انجام دیتے رہے، کام کی محنت و مشقت نے جہاں سخت ترین حالات سے ٹکرانے کی صلاحیت پیدا کی تھی وہیں مدرسے کی علمی فضا نے

انھیں فکری بالیدگی سے مالامال کر دیا تھا۔ جوانی کی ابتدا میں تحریک انقلاب میں سر گرم علماء سے آشنا ہوئے اور ان کی صحبت میں خالص اسلام کے اعلی معارف سے آگاہی حاصل کرتے رہے۔ اس کے ابتدائی مراحل میں علماء کی صحبت کا شرف ان کی درخشاں زندگی کا پہلا قدم تھا پھر یہی ماحول ان کی حیات کو منور اور بابرکت بناتا چلا گیا محمد انہیں انقلابی علماء کے توسط سے رہبر کبیر امام خمینی کے ارفع و اعلی افکار سے آشنا ہوئے۔ نوجوان محمد نے "نہ ظلم کرو نہ ظلم سہو" کے اسلامی نعرے کو اپنی مشعل زندگی بنالیا اور ظلم و ستم پر مبنی شاہی حکومت کی تاریکیوں کے خلاف جان و مال سے جہاد کرنے پر کمر بستہ ہو گئے۔

اس نوخیز حوصلے کو دوستوں نے سہارا دیا بڑوں نے سراہا اور بزرگوں نے راہنمائی کی یہاں تک کہ یہ فکر اور حوصلہ ایک نہایت مضبوط چٹان کے مانند مستحکم اور ناقابل شکست بن گیا۔ جس کی پناہ میں "توحیدی صف" جیسا گروہ ہمیشہ مطمئن اور کامیاب رہا۔ اس گروہ کی ہمہ گیر کارکردگی نے دنیا کو حیران کر دیا اسکی سر گرمیاں صرف سیاسی نہ تھیں بلکہ یہاں مذہبی، ثقافتی اور فوج سے متعلق امور بڑی مہارت کے ساتھ انجام دیئے جاتے تھے۔ "گروہ توحیدی صف" کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس کے اکثر ممبران اور اراکین تہران کے مختلف علاقوں کے فاقہ مست لوگ تھے، جو شور و غل، غرور و تکبر اور دکھاوے سے دور، صاف ستھرے اور سیدھے سادھے لوگ تھے۔ اور یہی وجہ تھی کہ

گروہ عوام و خواص کے ساتھ ساتھ نمایاں طور پر علماء اور پسماندہ مظلوم طبقہ میں بہت مقبول تھا،اسے ہر طبقے کی حمایت حاصل تھی اور ہر فرد کی محبت۔

محمد کی ابتدائی تعلیم مکمل ہو گئی تو انہیں حکومت کی طرف سے "دو سالہ لازمی خدمات" انجام دینے کے لئے بلایا گیا۔ محمد شہنشاہی حکومت کے لئے کام کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ وہ گھر سے فرار ہو گئے اور اپنے فکری اور عملی رہبر امام خمینی سے ملاقات کے لئے عراق کا ارادہ کیا۔ لیکن سرحد پر گرفتار کر لئے گئے اور "لازمی خدمات" کے لئے جبراً تہران لائے گئے۔

دو سال تک مجبوراً مذکورہ خدمات انجام دی پھر لازمی مدت ختم ہوتے ہی ایک بار پھر سیاسی سرگرمیوں میں مشغول ہو گئے۔ وہ ابتدا سے امام خمینی کے نزدیکی علماء سے رابطہ رکھنے کی کوشش کرتے۔ کچھ دنوں بعد ہی ثقافتی انجمنوں سے رابطہ برقرار کر کے امام خمینی کے بیانات اور ان کی طرف سے کئے گئے اعلانات کو چھاپنے اور شائع کرنے میں لگ گئے۔ وہ امام کے بیانات کو بڑے پیانے پر چھاپتے اور اپنے دوستوں کی مدد سے شہر تہران اور دوسرے تمام صوبوں میں شایع کرتے۔

1975 میں گرفتار کئے گئے اور کچھ دنوں تک "دژخیمان" جیل میں قیدی رہے۔ جیل کا ماحول بھی سازگار نہ تھا، مسعود رجوی اور منافقین،

ولایت فقیہ کے ماننے والوں کو "فتواہی" کہہ کران کا مذاق اڑانا چاہتے مگر محمد سینہ ٹھوک کر کہتے ہاں میں فتواہی ہوں میں امام کا مقلد ہوں سچ ہے محمد اپنی زندگی کی آخری سانس تک اپنے اس دعوے پر باقی تھے۔

محمد نے سترہ سال کی عمر میں شادی کی۔ تقریب شادی نہایت سادگی سے انجام پائی تھی۔ چند دوستوں کی موجودگی میں بغیر شور و غل اور ہلڑ ہنگامے کے دو وجود رشتہ ازدواج میں بندھ گئے "حسین" اور "سمیہ" ان سے دو فرزند تھے۔ "۱۹ دی" کو قم کی مقدس زمین بے گناہ علماء کے قتل عام سے رنگین ہو گئی۔ محمد نے اب اپنا فریضہ یہ سمجھا کہ مسلحانہ جدوجہد شروع کر دی جائے۔ محمد کی یہ جدوجہد انقلاب کی کامیابی پھر اس کے بعد استعمار کی مختلف سازشوں سے مقابلہ کرنے میں زندگی کی آخری سانسوں تک جاری رہی۔ ان کی مسلحانہ جدوجہد میں "خوان سالار بار" (جو امریکی جاسوسوں کا عشرت کدہ بنا ہوا تھا)، امریکی ایجنٹوں سے بھری بس، ٹائر کارخانہ، پاور ہاؤس اور کاخ نوجوان نامی کلب (جہاں عریاں رقص و موسیقی ہوا کرتی تھی) کو دھماکہ سے اڑا دینا ناقابل فراموش کارنامہ ہے۔ اسی طرح مختلف فوجی چھاؤنیوں، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی عمارت اور متعدد حکومتی دفاتر کو اپنے قبضہ میں لے لینا اور نہ جانے ایسے کتنے عظیم کارہائے نمایاں محمد کی انقلابی سرگرمیوں کی سرخیاں بنتے چلے گئے۔

گروہ توحیدی صف اور دوسرے چھ گروہوں کو ملا کر "مجاہدین انقلاب اسلامی" نامی تنظیموں کی تشکیل ہوئی۔ان تمام گروہوں کے افراد تحریک انقلاب میں بڑھ چڑھ کے حصہ لینے والے تھے جس وقت امام خمینی ایران واپس آئے تھے اس وقت سے لے کر انقلاب کی مکمل کامیابی تک امام کی حفاظت کی سب سے اہم ذمہ داری کو محمد کے ذمہ تھی جسکو انھوں نے بحسن وخوبی انجام دیا۔ انقلاب کی کامیابی کے بعد آپ "سپاہ پاسداران" کے بارہ ۱۲ بانیان میں سے ایک تھے۔

سپاہ کی مکمل تشکیل کے بعد اسی فوج میں کمانڈر بنائے گئے۔آپ ولی عصر نامی چھاؤنی میں فوجی ٹریننگ کے ساتھ ساتھ اور بھی بہت سارے فرائض انجام دیتے۔جب کردستان میں بغاوت شروع ہوئی ضرورت کا احساس کیا اور "کرمانشاہ" گئے پھر وہاں سے سندج تک سفر کیا اور راستہ بھر مختلف شہروں کو باغیوں سے نجات دلائی۔ بغاوت کا پہلا دور مہاباد میں ختم ہوا تھا لیکن یہ علاقہ ہمیشہ مختلف واردات کا مرکز بنارہا۔ چنانچہ محمد بروجردی کردستان میں فوج کی سربراہی میں مشغول ہوگئے اور دشمن کی مختلف سازشوں کو ناکام بناتے رہے۔ 27جولائی 1979 کو امام کے تاریخی بیان کے بعد جہاد نے ایک نیا رخ اختیار کرلیا تھا۔ محمد بروجردی نے شجاعت و دلیری کے بڑے جوہر دکھائے اور سرزمین کردستان کو انقلاب مخالف عناصر سے بالکل پاک

کردیا۔ کچھ دنوں بعد محمد کو مغربی ایران میں جدوجہد کرنے والی فوج کا فرمانروا مقرر کردیا گیااور وہ بچے کچے باغیوں کا بھی صفایا کرتے رہے۔

پھر انہوں نے "پیش مرگان مسلمانان کرد" نامی ایک تنظیم تشکیل دی جسے "سپاہ" کی مجلس اعلیٰ میں شہید بہشتی اور آقائی رفسنجانی کی مدد سے منظوری دلوانے کے بعد اس کی سربراہی اپنے ہاتھوں میں لے لی جس کے تحت انہوں نے صوبہ کردستان کے اکثر شہروں، قصبوں اور دیہاتوں میں سکونت پزیر قابل اعتماد افراد سے رابطہ قائم کیااور سب کو مسلح کردیا۔اس تنظیم کی ضرورت خود ان کے الفاظ میں یہ تھی:

"استکباری طاقتیں آگاہ ہوجائیں کہ عوام اور انقلاب مخالف عناصر ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ عوام اسلامی جمہوریت کی خواہاں اور حامی ہے۔ لہٰذا اسلامی جمہوریت کے زیر سایہ وہ مسلح ہوئے ہیں اور اپنی تمام تر قوتوں سے اسلام مخالف عناصر سے دو دو ہاتھ کرنے کو تیار ہیں۔"

کردستان میں باغیوں کے خلاف مسلحانہ مقابلہ کے شروع ہوتے ہی استکباری طاقتوں کے عوام فریب پروپیگنڈوں اور سازشوں سے پردہ اٹھتا چلا گیا۔اور پہلے ہی مرحلہ میں پورا "کامیاران" جسے کردستان فتح کرنے کا اصلی دروازہ مانا جاتا تھا یک جُٹ ہو کر

انقلاب مخالف عناصر کے مقابلہ صف بستہ کھڑا ہو گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے باغیوں کا پورا صفایا ہو گیا۔

جس وقت "سپاہ" کی سر گرمیوں کے لئے ملک کو مختلف ڈیویژنوں میں بانٹا گیا تو ہمدان، باختران، کردستان اور ایلام جیسے صوبوں کو شامل کرنے والے ڈیویژنوں کی ذمہ داری میرزا کو دی گئی۔ کچھ دنوں بعد انہوں نے "سید الشہداء حمزہ" کے نام پر ایک چھاؤنی بنوانے کی تجویز پیش کی جو فوراً قبول کی گئی اور جب چھاؤنی کا کام مکمل ہو گیا تو وہاں کی فرمانروائی بھی آپ کے سپرد کی جانے لگی لیکن محمد بروجردی نے معذرت طلب کرتے ہوئے عہدہ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ لیکن پھر انھیں مسلسل اصرار کا سامنا کرنا پڑا تو نائب فرمانروا کے عنوان سے خدمت انجام دینے پر راضی ہو گئے۔

محمد بروجردی کے کارناموں میں "شہداء ریجمنٹ" کی تشکیل بھی نمایاں مقام رکھتی ہے۔ کردستان میں تشکیل دی جانے والی یہ ریجمنٹ اپنی نوعیت کی انوکھی فوج تھی جس میں سپاہ، فوج، پولیس، ہی نہیں بلکہ ملک کی تمام مسلح طاقتوں اور گروہوں بلکہ رضاکارانہ خدمت انجام دینے والے برجستہ افراد بھی موجود تھے۔ ان قوتوں کے باہمی رابطہ نے دشمنوں کو مایوس کر دیا تھا اور کرد قوم دشمنوں کی سازشوں سے محفوظ ہو گئی۔ حسن معاشرت کے اعتبار سے پورے کردستان میں کوئی ان کا نظیر نہ تھا۔ مقامی لوگوں

سے ان کا ملنا جلنا اس طرح سے تھا کہ وہ انہیں میں سے ایک نظر آتے۔ عام آدمی کے دل انکی محبت اور عزت سے بھرے ہوئے تھے۔ ان کے اخلاق اعلیٰ ظرفی کے ان گنت واقعات ناقابل فراموش ہیں۔ عام لوگوں کے درمیان نہایت سادگی سے رہتے۔ آتے جاتے سب سے میل جول رکھتے اور یہی وجہ تھی کہ سارے لوگ انہیں اپنا سمجھتے تھے۔ کردی عوام نے کبھی انہیں غیر نہیں سمجھا جب کسی علاقے میں انقلاب مخالف عناصر پر قابو کر لیا جاتا تو یہ انکی عادتوں میں سے تھا کہ جیل جاتے اور وہاں باغیوں اور خاص طور پر اسلام مخالف جمہوریت پسند اور چھاپا مار لڑاکوں سے ضرور ملتے اور گھنٹوں ان سے بات چیت کرتے اگرچہ انہیں بارہا تاکید کی گئی تھی کہ جنگ کے دوران صف اول میں نہ رہیں لیکن وہ ہمیشہ جبین فوج کی زینت بنے رہے۔ ان کی زندگی کے حالات سے پتہ چلتا ہے کہ نہ جانے کتنی مرتبہ منزل شہادت سے قریب ہو کر یہ کہتے ہوئے لوٹے کہ

کار جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

یقینا خدا نے انہیں بارہا بچایا تاکہ اپنی کامیابی کی فہرست کو مزید طویل بنا سکیں۔ ایک بار تو انقلاب مخالف عناصر نے انہیں قیدی بھی بنا لیا تھا لیکن خدائی مدد سے انقلابی فداکاروں نے جان پر کھیل کر انہیں آزاد کرا لیا۔ متعدد بار زخمی ہوئے۔ بارہا اسپتال میں بھرتی رہے۔ ایک بار تو دشمنوں نے ان کے ہیلی کاپٹر کو گولیوں کا نشانہ بنایا ہیلی کاپٹر میں آگ لگ

گئی اور ہیلی کاپٹر گر پڑا محمد بروجردی شدید زخمی ہوئے لیکن ان کی جان بچ گئی۔ شہادت سے چند دن پہلے اپنے بھائی سے ٹیلیفون کے ذریعہ رابطہ قائم کیا اور ان سے درخواست کی کہ ان کے بیوی بچوں کو "ارومیہ" پہونچادیں۔ ساتھ ہی ان دنوں اپنے بدلے ہوئے رویہ سے گویا ایک بڑے اور ناقابل تعبیر حادثہ کی خبر دے رہے تھے جسکا اندازہ شہادت کے بعد کیا جاسکا

ان کی تشیع جنازہ میں پورا شہر سنندج امنڈ پڑا تھا۔ لوگوں کا سیلاب تھا جو اپنے محسن کو الوداع کہنے آئے تھے۔ اتنا بڑا مجمع اس سے پہلے کبھی اکٹھا نہیں ہوا تھا لوگوں کے گریہ وزاری کی بلند آوازیں بتارہی تھیں کہ محمد بروجردی کس قدر ہر دل عزیز تھے تشیع کے بعد جنازہ تہران بھیج دیا گیا لیکن اب بھی اس شہید کی یادیں کردستان کے ہر گلی اور ہر کوچے میں باقی ہیں۔

شہید بروجردی قائد انقلاب اسلامی کی نگاہ میں

مرحوم شہید بروجردی ایک برجستہ شخصیت کے حامل تھے۔ ایک بار میں 1980-81 کے شروعات میں مغربی علاقہ کی طرف گیا تھا اس وقت وہ "باختران" میں تھے میں نے ان کے کاموں کا نزدیکی مشاہدہ کیا۔ وہاں میں نے شہید بروجردی میں ایک

ایسی بات پائی جس سے میرے دل میں ان کے لئے بہت احترام پیدا ہو گیا۔ وہ بات یہ تھی کہ شہید بروجردی پوری سنجیدگی اور فکری بالیدگی کے ساتھ جس چیز بارے میں سوچتے تھے وہ محض وظیفہ اور ذمہ داری تھی۔ بعض لوگ انفرادی یا گروہی فکر کے ساتھ اس آدمی کا تعاون کرتے ہیں جو ان سے موافقت رکھتا ہو اور اس شخص کی مخالفت کرتے ہیں جو ان کے مفاد کے آڑے آتا ہو۔ لیکن شہید بروجردی کوئی ایسا فعل انجام نہیں دیتے تھے جس سے ایسا لگے کہ وہ اپنی ذات کے لئے خوش یا ناراض ہو رہے ہیں اسی بات نے ان سے میری لگاوٹ کو دوچند کر دیا۔ میری نظر میں ان کی پر سکون طبیعت، دوستوں کے ساتھ گھل مل کر رہنا، حلم اور بردباری، مخالفین کو فوراً معاف کر دینا جیسی صفات انکی عرفانی اور آفاقی شخصیت کی علامت ہیں۔

افسوس! انکے ساتھ ایسی معاشرت نہ رہی جس میں ان کے عرفانی حالات اور زندگی کی دوسری جزئیات سے آگاہ ہو سکتا۔ البتہ کسی شخص کی عادات واطوار اس کے مزاج اور نفسیات کی عکاس ہوتی ہیں۔

(قائد انقلاب اسلامی آیۃاللہ سید علی خامنہ ای)

امام خمینی سے پہلی آشنائی

"پیکر" کو سبھی جانتے تھے وہ ایک محنتی یہودی تھا۔ اس کا گدے بنانے کا کارخانہ ہدایت روڈ پر واقع تھا جس میں کام کرنے والے اکثر نوجوان تھے۔ پیکر یہ چاہتا تھا

کہ اس کے کاریگر اسی کی طرح محنتی اور زیادہ کام کرنے والے ہوں، وہ ان سب پر گہری نظر رکھتا تھا تاکہ یہ جان سکے کہ ان میں سے کون زیادہ جفاکش ہے۔ ان میں سے ایک کاریگر نے اسکی توجہ اپنی طرف جذب کرلی تھی۔ وہ "محمد بروجردی" تھے جو "میرزا" کے نام سے جانے جاتے تھے۔ وہ، لر قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ بروجرد کے ایک گاؤں "درہ گرگ" کے مولوی نامی ایک چوراہے کی ایک گلی میں اپنے ماں، بہن اور بھائیوں کے ساتھ رہتے تھے۔ انکا قد نسبتاً لمبا تھا سنہرے لمبے بال، لمبا چہرہ جس پر نیلی آنکھیں ہر دیکھنے والے کو جذب کر لیتی تھیں۔

پیکر نے دیکھا کہ محمد دوسرے کاریگروں سے زیادہ تیز اور توجہ سے کام کرتے ہیں۔ وہ اس وقت نوجوان تھے اور اس کمسنی میں بھی نہایت سرعت اور مہارت کے ساتھ گدوں کی بھرائی میں لگے ہوئے تھے۔ پیکر دیکھ رہا تھا کہ کس طرح محمد گھنٹوں سلائی مشین پر سر جھکائے پوری توجہ سے "گدوں" کے کناروں کی سلائی میں مشغول رہتا ہے۔ وہ اس محنت کو دیکھ کر بہت خوش ہوتا تھا اور یہ سوچتا کہ بہت اچھا کاریگر ہاتھ لگا ہے۔ وہ "میرزا" کی موجودگی میں اور زیادہ "آرڈر" لے سکتا تھا البتہ وہ میرزا کے اخلاق سے راضی نہ تھا کیونکہ وہ نماز بھی پڑھتے تھے اور آرام کے وقفہ میں ایسی باتیں کیا کرتے جو پیکر کو پریشان کر دیتی تھیں۔ اور خاص طور پر انکا روزانہ نماز ظہر کے لئے فخر آباد مسجد جانا پیکر کو ناگوار گذرتا تھا۔ پیکر خاموش رہنے والوں میں سے نہ تھا۔ وہ میرزا کے مستقبل کو لیکر بہت پریشان تھا اسے ڈر تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو میرزا کارخانہ سے اٹھا کے قید خانے کی سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا جائے۔ پیکر نے محسوس کر لیا تھا کہ یہ جوان بے چون وچرا کسی بھی بات کو مان لینے والا نہیں ہے۔ وہ پریشان تھا کہ کبھی بھی وہ اپنے اس کاریگر سے ہاتھ دھو سکتا ہے۔

یقینا پیکر کی پیشن گوئی زیادہ غلط نہ تھی۔ایک روز تو میر زانے وہ کام کیا جس سے ظاہر ہو گیا کہ پیکر کا فکر مند رہنا بے بنیاد نہیں ہے۔اس دن پیکر کے کاریگر کام میں مشغول تھے کہ ایک سات یا آٹھ سالہ بچہ کارخانے میں داخل ہوا اسے کوئی بھی نہیں پہچانتا تھا۔ لیکن ظاہر تھا کہ بچہ بہت شریر ہے۔"حسن"نامی ایک کاریگر نے بچہ سے کہا"اے بچے کیا چاہئے ؟" بچہ نے مسکرا کر گدوں پر چھلانگ لگائی۔ میر زا جو آنکھ کے گوشوں سے اسے دیکھ رہے تھے حسن سے مخاطب ہوئے اور کہا" جانے دو بچہ ہے کھیلنے دو"لیکن بچہ کچھ ہی دیر میں کارخانہ الٹ پلٹ کرر کھ دینے پر آمادہ نظر آیا۔ میر زا کے بڑے بھائی علی محمد نے بچہ کو سنبھالنا چاہا۔ لیکن بچہ شرارتوں سے باز نہ آیا۔اب باقی سبھی کاریگر اپنے ہاتھ روکے بچہ کو ہی دیکھ رہے تھے حسن سلائی مشین سے اُٹھ کر بچہ کے پاس آیا بچہ کو پکڑ کر کہنے لگا۔"اے چلو بھاگو یہاں سے، تم نے تو کارخانہ کا کام روک دیا ہے"چھوٹا بچہ لڑتا رہا اور اچانک اس نے حسن کے ہاتھ میں دانت کاٹ لیا، جس پر حسن نے اسے ہلکا سا طمانچہ لگا دیا۔بچہ روتا ہوا باہر بھاگ گیا لیکن ابھی ایک گھنٹا بھی نہ گذرا تھا کہ ایک قوی ہیکل آدمی کارخانہ میں وارد ہوا اسے سب پہچانتے تھے، عبداللہ قصاب محلہ کا غنڈا اور چھنٹا ہوا بد معاش تھا۔ کاریگروں کے ہاتھ رک گئے ، سبھی دم سادھے قصاب کو دیکھنے لگے ، قصاب بلند آواز میں چلا کر اپنے لڑکے سے پوچھنے لگا"کون تھا جس نے تم کو مارا؟"بچہ حسن کو ڈھونڈھنے لگا، حسن اس وقت کارخانہ میں موجود نہ تھا اور اسکی سلائی مشین پر علی محمد بیٹھا ہوا تھا۔ بچہ نے اپنی انگلی سے علی محمد کی طرف اشارہ کیا اور عبداللہ قصاب اپنے بچہ کا ہاتھ چھوڑ کر آگے بڑھا اور علی محمد کو کچھ بولنے کا موقع دئے بغیر اسے ایک زبردست ہاتھ لگا دیا۔ایک تو علی محمد خود بھی لڑائی جھگڑے والا نہ تھا دوسرے وہ قصاب سے بخوبی واقف تھا اس لئے بغیر کچھ جواب دیئے سر جھکا کر بیٹھا رہ

گیا لیکن میرزا نے تیز نگاہوں سے قصاب کو دیکھا اور کہا! اس کو کیوں مارا؟ عبداللہ قصاب ہنسا اور کہنے لگا یوں ہی میرا دل چاہ رہا تھا کیا کرلو گے ؟ میرزا اپنی جگہ سے اٹھے وہ غصہ سے کانپ رہے تھے اور عبداللہ قصاب نہایت اطمینان سے انہیں دیکھ رہا تھا میرزا نے ایک مضبوط اور بھاری لکڑی کا ٹکڑا ہاتھ میں اٹھالیا جس سے گدوں کی دھنائی کی جاتی تھی اور قصاب کے مقابل میں آکر کھڑے ہوگئے اس بار قصاب نے زوردار قہقہہ لگا کر کہا! تم چوزے ہو بچے یہ جملہ سنتے ہی میرزا نے اس لکڑی سے قصاب کے سرپر دے مارا ضرب اتنی سرعت کے ساتھ اور محکم تھی کہ عبداللہ قصاب آہ بھی نہ کرسکا اور زمین پر ڈھیر ہوگیا وہ تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ ایک معمولی انسان اسے مارے گا جسے شہر کے بڑے بڑے غنڈے موالی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے۔ اسی درمیان میرزا نے ایک اور ضرب اس کے کندھے پر لگائی ساتھ ہی دوسرے کاریگر بھی اسکی پٹائی میں شامل ہوگئے۔ اگر قصاب فرار کو مقابلہ پر ترجیح نہ دیتا اور پیکر وہاں آن کر بیچ بچاؤ نہ کرتا تو شاید اسی سڑک پر لوگ اسکی لاش دیکھتے۔ اگرچہ اس واقعہ کے بعد عبداللہ قصاب نے ایسا فرار اختیار کیا کہ پھر کبھی دکھائی نہ دیا لیکن پیکر چند دنوں تک ایک لمحہ کے لئے بھی کارخانہ سے اس خُوف سے باہر نہیں گیا کہ کہیں قصاب اپنے گرگوں کے ساتھ آکر کارخانہ پر حملہ نہ کر بیٹھے۔ لیکن شاید قصاب کو اپنی کھلی شکست نے اس قدر خجل کیا تھا کہ اس نے بدلہ لینے کا سودا اپنے سر سے اتار پھینکا تھا۔ لیکن اس دن کے بعد پیکر کو ہمیشہ یہی خوف لگا رہتا کہ کسی دن میرزا خود اسی کے مقابلہ میں نہ آجائیں۔ لہٰذا ہمیشہ میرزا کے سامنے حق کو ناحق بتانے اور کرنے سے پرہیز کرتا اور قوم لرہ کے اس جوان سے کسی قسم کی زبردستی کرنے کا تصور بھی اپنے ذہن سے نکال بیٹھا تھا۔ کاش یہ معاملہ یہیں ختم ہوگیا ہوتا لیکن میرزا روز بروز پیکر کے لئے مشکلوں کی وجہ

بنتے رہے۔اب تو میر زا ہر شب جمعہ کو تہران کے عسکر آ باد جاتے اور آ قای شیخ عبداللہ نامی ایک نوجوان عالم دین کے درس میں شرکت کرتے۔ شیخ عبداللہ حکومت مخالف علماء میں سے تھے عقائد اور نہج البلاغہ کی تفسیر کا درس دیتے تھے۔ یہ دروس عام لوگوں کی نگاہوں سے دور مخفی طریقہ سے ہوتا تھا۔ میر زا کو ان کے خالو نے اس استاد سے متعارف کروایا تھا اور زیادہ وقت نہیں گذرا تھا کہ میر زا شیخ عبداللہ کے بہترین اور برجستہ ترین شاگردوں میں شمار کیئے جانے لگے۔ دوران درس میر زا کا کثرت کے ساتھ اچھے سوالات کرنا بتارہا تھا کہ وہ جلد سیر اب نہ ہونے والی ایک تشنہ روح کے مالک ہیں۔ میر زا نہج البلاغہ سے جو سیکھتے بالخصوص "اجتماعی عدالت" سے متعلق باتیں دوسروں کو بھی سمجھاتے اور انہیں ظلم کے سامنے تسلیم نہ ہو جانے کا درس دیتے۔

مرجع تقلید کا انتخاب ایک بڑا قدم ہوتا ہے میر زا کو پتہ چلا کہ ان دنوں سرحد پار عراق میں واقع شہر نجف میں ایک بوڑھا مجتہد اور پایہ کا عارف اپنی زندگی برسوں سے جلا وطنی کے عنوان سے گزار رہا ہے۔ کیونکہ اسے اپنے ملک لوٹنے کی اجازت نہیں ہے۔ میر زا نے طے کیا کہ اسی کی تقلید کریں گے۔ ساتھ ہی ان میں ایک عجیب اضطراب پیدا ہو گیا تھا وہ روز آنہ اپنے استاد شیخ عبداللہ سے اپنے مجتہد کی جلا وطنی اور "پندرہویں خرداد" کے واقعات کے بارے میں مختلف سوالات کیا کرتے۔ شیخ ان کے سوالات کا جواب دیتے اور ساتھ ہی تاکید کیا کرتے تھے کہ، موصوف کا نام کبھی سرِ عام نہ لینا اور بجائے اس کے کہ انہیں آیۃ اللہ خمینی کہو صرف 'آقا' کہا کرو۔

اس کے بعد میر زا کی زندگی میں ایک نیا رخ آ گیا تھا۔انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اب انہیں ایک یہودی کے یہاں کام نہیں کرنا چاہیئے۔ لہٰذا انہوں نے پیکر کے ساتھ

تعاون کرنا چھوڑ دیا۔اور کسی بہانے کی تلاش میں تھے کہ کارخانہ کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ سکیں۔ علی محمد اوران کی ماں نے سمجھا کہ میرزا آشفتگی کے شکار ہو گئے ہیں پیکر نے ان لوگوں سے کہا کہ میرزا کی شادی کردی جائے جس سے انکا لاابالی پن ختم ہو جائے گا اور جوانی کا شور ولولہ ٹھنڈا پڑ جائے گا۔ان کی ماں نے اس سلسلہ سے خاندان اور ہمسایوں میں تگ ودو شروع کردی تلاش جلد ہی کار آمد ثابت ہوئی اور اپریل 1973 میں میرزا کی شادی ان کی خالہ زاد بہن سے کردی گئی۔سب سے زیادہ پیکر خوش ہوا وہ اس فکر میں تھا کہ اب تو میرزا اس کے یہاں کام ہرگز نہ چھوڑیں گے۔ لیکن میرزا کو نہ پیکر کی فکر تھی نہ کام کی پرواہ۔میرزا کی لازمی ملکی خدمت میں شمولیت کے لئے صرف چند ماہ باقی بچے تھے لیکن وہ بارہا اپنی ماں اور بھائی سے کہہ چکے تھے کہ "میں اس شاہی حکومت کے لئے کوئی خدمت انجام نہ دوں گا" اگرچہ وہ خود بھی جانتے تھے کہ اس سے بچنے کی کوئی راہ نہیں ہے۔آخرکار اسی سال غم وغصہ سینے میں دبائے بادل رنجیدہ سرحدی فوجی افسر کے پاس مذکورہ خدمت کے لئے خود کو متعارف کروادیا۔

میرزا اور مسئلہ تقلید

"کوچہ مرغی ھا" نامی گلی میں ہر پنجشنبہ کو میلا سا لگ جاتا تھا یہاں زیادہ تر پالتو جانور اور پرندوں کی خرید وفروخت کی جاتی۔اس بھیڑ میں سدھائے کبوتروں کے خواہاں کی تعداد سب سے زیادہ ہوتی۔ لڑاکو مرغے اپنے مخصوص انداز میں پروں کو پھٹ پھڑاتے آواز نکالتے اور اس طرح گویا خریداروں کو لبھاتے۔ میرزا اس بھیڑ کو پیچھے چھوڑتے

ہوئے اگلی گلی میں مڑ گئے اب کان پھاڑ دینے والے مرغی بازار کے شور کے بجائے 'مہدوی مسجد' سے اذان کی دلنشیں آواز میرزا کے کانوں سے ٹکرا رہی تھی۔ تبھی میرزا کی نگاہ دور سے آتے ہوئے اپنے بھائی پر پڑی انہوں نے وضو کے لئے آستین پہلے ہی سے چڑھا رکھی تھی۔ میرزا نے مسکراتے ہوئے سلام کیا اور اپنی آستینیں بھی وضو کے لئے اوپر چڑھانے لگے۔ مسجد محترمہ زینب کے گھر سے بہت نزدیک تھی۔ میرزا اور محمد ہمیشہ اذان کے ساتھ ہی ساتھ مسجد پہنچ جایا کرتے تھے۔

میرزا نے کارخانہ میں بہت زیادہ کام اپنے ذمہ لے لیا تھا۔ اب ان کے پاس فٹ بال کھیلنے اور ورزش گاہ جانے کا نہ وقت رہ گیا تھا اور نہ ہی حوصلہ۔ دوستوں سے ملاقات کے لئے بہشتی بازار میں ایک جگہ معین کر رکھی تھی۔ یہ بازار مولوی کے جنوبی محلوں میں گنا جاتا تھا۔ وہ لوگ مسجد میں بھی ملتے تھے۔ رحمت، امیر ہمیشہ پہلے سے ہی میرزا کے منتظر رہتے۔ میرزا اپنے دئے گئے وعدہ کو ہمیشہ پورا کرتے وہ اس سلسلہ میں بہت حساس تھے ان کی عادت واطوار سب کے ساتھ گرم جوشی سے ملنا باعث بنتا کہ نوجوان جلد ہی ان سے مانوس ہو جاتے۔ کبھی کبھارا اگر میرزا ان لوگوں کے ساتھ فٹ بال کھیلنے یا سنیما دیکھنے چلے جاتے تو اس کا مقصد بھی ان سے رابطہ کو استحکام اور عمق بخشنا ہوتا۔ نماز کے بعد سب میرزا کے ساتھ ہی مسجد سے باہر نکلتے ان جوانوں میں اکثر محترمہ زینب خاتون کے کرایہ دار تھے۔ گھر میں داخل ہوتے ہی قدیمی ساخت کی ایک طویل دالان تھی جس سے منسلک کمرہ میں یہ لوگ کرایہ دار کے عنوان سے رہ رہے تھے۔ گھر کے سامنے کے حصہ پر نیلے رنگ سے کاشی کا کام بنا ہوا تھا۔

دقّ الباب کیا گیا۔ میر زا نے چند بار 'یااللہ' کی صدا بلند کی تا کہ خواتین پردہ کا اہتمام وغیرہ کر لیں میر زا نے اپنی اس عادت سے مہمان سرا نما اس گھر کو نظم ونسق اور اسلامی تہذیب کا عادی بنا دیا تھا۔ یہاں تک کہ خود انکے ہم عمران کی اس نیک عادت کی پیروی کرتے تھے۔ گھر کے بزرگوں کو یقین ہی نہیں ہوتا تھا کہ یہ وہی میر زا ہے جو دن بھر شرارتیں اور دوسروں کو پریشان کیا کرتا تھا۔ ڈیوڑھی میں داخل ہوتے ہی میر زا کی نگاہ محترمہ زینب کے لڑکے ہوشنگ پر پڑی۔ وہ دیوڑھی میں آواز کے گونجنے سے بہت خوش ہوتا تھا۔ دیوڑھی کی چھت کافی بلند تھی اسکے دونوں ستون جن پر چونے سے کاشی کا کام کیا گیا تھا۔ ہوشنگ نے جابجا سیاہی لگا دی تھی۔

آنگن میں وارد ہوئے تو دیکھا کہ کچھ بچیاں حوض کے اطراف برتن صاف کرنے میں مصروف ہیں۔ اعظم اور ملوک نے ان لوگوں کو سلام کیا۔ ملوک شقاقی کی بہن تھی اس کی ماں ابھی ابھی تھکی ہوئی کام سے لوٹی تھی اور دروازہ پر ہی بیٹھ گئی تھی وہ میر زا کا بہت خیال رکھتی تھی۔ اپنی زندگی کا بار خود اپنے کندھوں پر اٹھائے ان عورتوں کے تھکے اور مرجھائے چہرے ہر درد مند انسان کو متاثر کر دیتے تھے۔ میر زا آنگن کے ایک کونے میں واقع تنگ زینوں سے اوپر چلے گئے۔ یہ سیڑھیاں ایسی تھیں کہ سیدھے چڑھنے پر سر کا اسکی چھت سے ٹکرا جانا لازمی تھا اسئلے ہر کوئی رکوع کی حالت میں اوپر جاتا تھا۔ اپنے گھر میں داخل ہوتے ہی ماں کی محبت آمیز میٹھی مسکراہٹ نے انکا استقبال کیا۔ کھانے کی خوشبو سے پورا گھر معطر تھا۔ گھر کا ایک اکیلا لیمپ کمرہ کے وسط میں روشن تھا جس کے چاروں طرف دھوئیں نے حصار کر رکھا تھا۔ میر زا نے سلام کیا اور بیٹھ گئے۔ میر زا نے ماں سے کہا آج مین سلطنت خالہ کے گھر جاؤں گا۔ انجمن کی پذیرائی کا کام آج ان کے ذمہ ہے

کیا آپ بھی ساتھ چلیئے گا؟ ان کی ماں نے ایک نگاہ پتیلی کی طرف کی اور جواب دیا: میرا بھی دل بہت چاہ رہا ہے لیکن اتنی رات گئے میرا جانا مشکل ہے۔ تم خود چلے جاؤ۔ یہیں محلہ کی مسجد میں ایک مجلس منعقد ہونے والی ہے میں اسی میں شرکت کروں گی۔

میرزا کو پچھلے دنوں کچھ اچھی آمدنی ہوئی تھی جس سے گھر کے حالات نسبتاً بہتر ہو گئے تھے۔ اب ماں کو فکر مند رہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میرزا میں اس وقت تھکاوٹ کی زیادتی کے سبب باہر جانے کے ہمت نہ تھی۔ لیکن سلطنت خالہ کے گھر منعقد عزاداری میں شریک ہونے کے لئے میرزا بیتاب تھے اس بیتابی کا اصل سبب اس انجمن کے عالم دین کی جدید اور جذاب باتیں تھیں۔ آج تک میرزا نے ایسی باتیں نہیں سنی تھیں۔ وہ آسودہ مزاج اور نہایت ہی متین طبیعت کے مالک تھے۔ میرزا ایسا محسوس کرتے تھے کہ آقا عبداللہ کے مسکراتے چہرہ کے پیچھے ایک اضطراب کروٹیں بدلتا رہتا ہے۔ آخر کیوں؟ جب آقا عبداللہ کا گھر "مولوی" علاقے میں ہے تو وہ کیونکر عسکر آباد کی مجالس میں شرکت کرتے ہیں۔ میرزا نے انہیں بارہا اپنے محلے میں دیکھا تھا اگرچہ مسجد باب الحق میں وہ کبھی دکھائی نہ دیئے۔

اے بیٹا کھانا کیوں نہیں کھا رہے ہو! کن خیالات میں کھوئے ہوئے ہو۔ ماں کی آواز نے میرزا کے خیالات کے تار توڑ دیئے۔ میرزا کی ایسی کیفیت ماں کے لئے کوئی نئی چیز نہ تھی۔ اس سلسلہ سے کبھی کبھی وہ اس قدر پریشان ہو جاتی کہ انہیں کسی "دعا نویس" کے پاس لے جانے کی فکر کرنے لگتی۔ میرزا اب جانے کے لئے آمادہ ہو چکے تھے۔ سیڑھیوں کے نیچے رحمت، استاد ابراہیم حسن جن کو بچے امیر کہہ کر پکارتے تھے اور شقاقی ان کا انتظار کر رہے تھے۔ یہ لوگ چہل قدمی کرتے ہوئے سڑک پر نکل آئے۔ خراسان چوراہے پر

بڑی بھیڑ تھی۔ چاروں طرف سے لوگ اپنی اپنی منزل کی جانب بڑھے چلے جارہے تھے مختلف منزلیں مختلف راہیں اور مختلف راہی۔ اس بھیڑ کے درمیان یہ چاروں نوجوان منزل سعادت کی کھوج میں تیزی سے عسکرآباد کی جانب اپنے قدم بڑھارہے تھے۔ مسگر آباد''مولوی'' کی بست نو آباد علاقہ تھا لیکن یہاں کی حالت مولوی سے کچھ زیادہ بہتر نہ تھی۔ شہر سے نزدیک واقع اس نو آباد بستی میں لوگوں نے چند کمروں پر مشتمل چھوٹے چھوٹے مکان بنالئے تھے۔ علی آقا نے بھی اپنے لئے یہاں ایک مکان خود ہی تعمیر کیا تھا۔ مکان کے سامنے ٹھیک دروازے پر سبز رنگ کا ایک پرچم نصب تھا۔ خود علی آقا دروازہ پر کھڑے لوگوں کا استقبال کر رہے تھے۔ ان کی نگاہ میرزا پر پڑی تو مسکرا کر بولے! خوش آمدید میرزا تم نے تو فوج اکٹھا کر رکھی ہے۔ میرزا اور ان کے دوست اندر داخل ہو گئے اچھے خاصے لوگ پہلے سے ہی کمرہ میں موجود تھے۔ میرزا کی نگاہ فوراً ہی آقا عبداللہ کی طرف مرکوز ہو گئیں۔ عالم دین سر جھکائے بیٹھے تھے۔ وہ میرزا کی تجسس آمیز نگاہ کو بھانپ گئے تھے۔ میرزا ایک کونے میں بیٹھ گئے یہ جگہ ایسی تھی کی جب آقا عبداللہ جانے لگتے تو میرزا سے ضرور روبرو ہوتے۔ جب علی آقا بھی وہیں آ گئے تو مجلس شروع ہوئی آقا عبداللہ ایک چوبی کرسی پر جو وہاں پہلے ہی مہیا کر دی گئی تھی بیٹھ گئے ان کی نگاہ میرزا اور انکے دوستوں پر پڑتی جنہیں وہ پہلی بار دیکھ رہے تھے۔ چند نئے نوجوان چہروں کا وجود جو ان کی باتیں سننے آئے تھے آقا عبداللہ کے لئے باعث مسرت تھا۔ اس دن انہوں نے تقلید اور مرجع تقلید سے متعلق مسائل بیان کئے۔ ابتدا میں احکام شریعت بیان کئے۔ پھر بحث تقلید مجتہد اور فقاہت کے سلسلہ میں شروع ہوئی۔ بحث کا دامن بہت وسیع ہوتا جارہا تھا کہ آقا عبداللہ نے محسوس کیا کہ اب اس کے آگے کی باتیں سیاسی نقطہ نظر سے مخدوش اور پر

خطر واقع ہو سکتی ہیں انہوں نے بات وہیں چھوڑ دی۔ گفتگو کا یوں بیچ میں چھوڑا جانا میرزا کی مزید حساسیت کی وجہ بن گیا۔ آقا عبداللہ لوگوں کو یہ سمجھانے پر زور دے رہے تھے کہ مکلف کے لئے ہر صورت میں ایک جامع الشرائط مجتہد کی تقلید کرنا ضروری ہے۔ اور اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو اسکے اعمال کا کیا نتیجہ ہوگا کچھ معلوم نہیں۔ لہٰذا آپ سب کو چاہئے کہ اپنا مرجع تقلید معین کریں اور اپنی زندگی کو اس کے رسالہ عملیہ کے مطابق ڈھالئے۔

آقا عبداللہ اپنی تقریر ختم کرکے وہیں کرسی کے نزدیک فرش پر بیٹھ گئے۔ مجلس کے ختم ہوتے ہی علی آقا ایک بڑی سینی لیکر داخل ہوئے جس میں چائے کی پیالیاں سجی تھیں۔ انہوں نے میرزا کو اشارہ کیا وہ فوراً اٹھے اور قند کا برتن ہاتھ میں لے کر علی آقا کے پیچھے پیچھے چلنے لگے لوگ اپنے ذوق کے مطابق ایک مقدار میں قند کے چوکور ٹکڑے اٹھا لیتے۔ اب وہاں موجود لوگ چھوٹے چھوٹے جتھے بنائے زندگی کے مختلف مسائل پر تبادلہ خیال کر رہے تھے۔ امیر، رحمت اور شقاقی حال کے ایک گوشے میں ساکت بیٹھے تھے گویا ان کے پاس گفتگو کا کوئی موضوع ہی نہ ہو۔ دھیرے دھیرے لوگ جاتے رہے جب تقریباً سبھی لوگ چلے گئے تو میرزا اپنے دوستوں کے ساتھ آقا عبداللہ کے پاس جاکر بیٹھے۔ دوستوں کا تعارف کروانے کے بعد بولے ہم اپنے لئے ایک مرجع تقلید کا انتخاب کرنا چاہتے ہیں۔ آقا عبداللہ متحیر ہوگئے ان کو امید نہ تھی کہ یہ جوان اتنی جلدی ایسے مسائل میں دلچسپی لیں گے۔ آقا عبداللہ کی تشویش علی آقا اچھی طرح سمجھتے تھے اس لئے بیچ میں آتے ہوئے بولے ! ابھی جانے دو اس موضوع پر بعد میں گفتگو ہوگی۔ رات کافی گذر چکی ہے اور تم لوگوں کو مولوی تک جانا ہے دشواریاں پیش آسکتی ہیں۔ میرزا

نے خالو کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ علی خالو آپ پریشان نہ ہوں ہمارے لئے ایسے بہت کم مواقع آتے ہیں کہ ہم مولانا سے گفتگو کر سکیں۔

میرے مرجع تقلید آقا خمینی ہیں۔ وہ ابھی جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے ہیں اسی لئے میرا رابطہ بھی صرف ان کے رسائل عملیہ سے ہے۔ آقائی عبداللہ نے کہا اور عبا کی تہوں میں چھپی ایک کتاب باہر نکالی اور میرزا کے سامنے رکھ دی۔ جسکی سادہ سی سفید جلد پر باریک خط سے "توضیح المسائل" لکھا ہوا تھا۔ میرزا نے ہاتھ بڑھا کر کتاب اٹھانی چاہی لیکن آقا عبداللہ نے فوراً ہی کتاب واپس اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔اس کتاب کو پاس رکھنا جرم محسوب کیا جاتا ہے۔ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ تم اس مسائل میں وارد ہو۔ جو مسئلہ بھی درپیش ہو مجھ سے پوچھ لیا کرو میں تفصیل کے ساتھ بیان کرونگا۔ میرزا کا دھیان آقا عبداللہ کی باتوں پر نہ تھا انکی پر اشتیاق نگاہ تو صرف رسالہ عملیہ پر تھی۔ بات یہیں ختم ہو جائے اس لئے آقا عبداللہ فوراً ہی اٹھ گئے۔ وہ گھر سے باہر نکل گئے اور میرزا کو اسی حالت میں بیٹھا چھوڑ گئے جن کے دل میں نہ جانے کتنے سوالات اور آرزوئیں تھیں۔

مقدس خودی

کارخانہ میں داخل ہوتے ہی ان کا سامنا "احمد" سے ہوا۔احمد نے ان پر ایک ملامت آمیز نگاہ ڈال کر انکی دیر آمد پر اپنا اعتراض جتایا۔اس کارخانہ میں کام کرتے ہوئے اب کئی برس گزر چکے تھے۔اب تو وہ ایک ماہر استاد بن گئے تھے۔ یہ کارخانہ "دروزاہ

شمیران" کے ایک محلہ میں واقع تھا۔ اسکا مالک ایک مصروف شخص تھا۔ عمارت کی پہلی منزل پر ایک طویل وعریض ہال واقع تھا۔ جسکے عقبی دیوار میں لگی کھڑکی ہال میں پھیلی ہوئی روشنی کا واحد ذریعہ تھی۔ کارخانہ کے اگلے حصہ میں ایک کمرہ نسبتاً اچھی حالت میں تھا۔ یہیں تیار شدہ مال خرید وفروخت کے لئے گاہکوں کے سامنے پیش کیا جاتا تھا۔ عمارت کے تہ خانہ نماز مین دوز کمرہ گودام کے طور پر استعمال ہوتا۔ ہال کی طرح یہ وسیع کمرہ ہمیشہ روئی اور اسفنج سے بھرا رہتا تھا کارخانہ کے عقبی حصہ مین ایک لمبی چوڑی دالان تھی جہاں کچھ کاریگر مشینوں پر کام کیا کرتے تھے۔ میرزا لباس تبدیل کرنے کے لئے پچھلے حصے کی طرف چل دیئے۔ میرزا نے ابھی تک یہاں کام کرنے کے لئے کسی قسم کی رغبت ظاہر نہیں کی تھی۔ صبح میں وہ سب سے آخر میں آتے اور شام کو سب سے پہلے چلے جاتے۔ ان کی کام کی اجرت کارخانہ کا مالک ہر ہفتہ کے آخر میں انکی ماں کو دے آتا تھا۔ ادھر کچھ دنوں سے میرزا نے سیر و تفریح کے لئے تھوڑا پیسہ لینا شروع کر دیا تھا۔ لیکن ابھی تک میرزا کارخانے کے مالک سے ربط و ضبط قائم نہیں کر سکے تھے۔ ایک دن کاریگروں نے دیکھا کہ میرزا کام کے بنسبت بہت سنجیدہ نظر آرہے ہیں۔ کام کی جانب انکی دلچسپی نے سارے کاریگروں کے ساتھ ساتھ انکے بھائی کو بھی تعجب میں ڈال دیا۔

استر کے درمیان انکا نہایت مہارت اور سرعت کے ساتھ روئی کا بھرنا انکے سابقہ رویہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے یقینا تعجب خیز تھا۔ ہاں ادھر کچھ دنوں سے انہوں نے اپنے کام کی طرف توجہ دینی شروع کی تھی اور وہ دوسروں کے امور میں دخالت کرنے سے گریز کرنے لگے تھے۔ کارخانہ کا مالک پیکر جسکی عمر پچاس سے زیادہ کی ہو چکی تھی تجارت کے رموز سے بہت اچھی طرح واقف تھا۔ زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنا اسکا نصب

العین تھا۔ لیکن ابھی تک جو ترقی اسنے حاصل کی تھی اسکی اصل وجہ وہ کاریگر تھے جو کم مزدوری پر اس کے یہاں دن رات کام پر لگے رہتے تھے۔ پیکر شمال شہر سے آنے والے گاہکوں سے بڑی خوش اخلاقی سے ملتا۔ اسکی تمام تر کوشش یہ رہتی کہ کوئی ثروتمند خریدار اسکے ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ ابھی جس وقت میرزا کچھ پیسہ لینے کی خاطر اسکے پاس گئے تو وہ ایک دولتمند گاہک سے اپنے مخصوص انداز میں گفتگو کر رہا تھا۔ ایک ایسے معاملے کی بات طے ہو رہی تھی جو پیکر کے لئے کافی فائدہ مند ہوتی۔ میرزا حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے پیکر اتنا کم فہم نہ تھا کہ وہ میرزا کی نگاہوں کو نہ پہچان سکتا وہ سوچ رہا تھا کہ یہ نیا کاریگر اپنی حدوں سے نکل کر اسکے نجی کاموں میں کچھ زیادہ ہی دلچسپی لیتا ہے۔ لیکن اس قسم کے کاریگروں سے کیسے کام لیا جائے اس سے بھی پیکر اچھی طرح واقف تھا۔ اور اتفاقاً اسے اس طرح کے ہوشیار اور چوکنّے کاریگر بہت پسند تھے۔ پیکر خریدار کے ساتھ اس قدر محویت کے ساتھ گفتگو کر رہا تھا گویا دنیا ومافیہا سے پوری طرح غافل ہو، پیکر کہہ رہا تھا! ہم کبھی بھی کسی کو واپس نہیں کرتے ہمارے لئے سبھی گاہک آپ کی طرح قابل احترام اور لائق تکریم ہیں۔ خریدار بھی اسکی ہاں میں ہاں ملانے میں پیچھے نہیں تھا، جوابی مسکراہٹ اور سر کے ہلکے جھٹکوں سے وہ مسلسل پیکر کی تائید کئے جا رہا تھا۔ پیکر یہی باتیں ہر گاہک سے کیا کرتا تھا۔ خاص طور پر جب خریدار دولت مند طبقے سے تعلق رکھتا ہو اور اس کی اکثر گاہک ثروتمند ہی ہوا کرتے تھے۔ انکا حد درجہ احترام کرنا معاملہ کی پہلی شرط ہوا کرتی ہے۔ ایسے موقعوں پر کاریگر کچھ زیادہ ہی دلچسپی سے کاموں میں مشغول رہتے وہ جانتے تھے کہ پیکر معاملہ طے کرتے وقت خریداروں کو یہ دکھانا چاہتا ہے کہ اسکے کاریگر نہایت مہارت وظرافت کے ساتھ گدے تیار کرتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر کسی کاریگر کی اتنی جرأت نہ

تھی کہ وہ ضروری حاجت کے لئے بھی اپنی جگہ سے اٹھ جائے۔ سبھی ہفتہ کے آخر ملنے والی بخشش کی امید میں پیکر کی توجہ اپنی طرف مرکوز کرنے کی سعی کرتے۔ معاملہ کی بات ختم ہونے پر خریدار گیلری سے ہوتا ہوا باہر نکل گیا اسکے ہاتھ میں ایک ٹینس بال تھی جس سے وہ دوران گفتگو مشغلہ کرتا رہا۔ گاہک کارخانے سے جا چکا تھا۔ پیکر ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں الجھا کر ایک دوسرے پر قوت صرف کرنے لگا۔ اسکی یہ حرکت اس کے دلی جذبات کی بھرپور عکاس تھی کہ اس نے ایک بہت فائدہ والا معاملہ طے کر لیا ہے اس خیال کے آتے ہی اسکا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا۔ اسکی نگاہ میرزا پر پڑی جو کارخانہ کے سامنے والے میوہ فروش کے ٹھیلے پر سے ایک سیب اٹھالائے تھے اور اسے کھانے میں مشغول تھے۔ پیکر نے ایک پھیری لگانے والے بوڑھے کو اجازت دے رکھی تھی کہ وہ اپنا ٹھیلا کارخانے کے سامنے لگائے اسکی عوض وہ بوڑھا کارخانے کی چوکیداری کرتا اور کبھی کبھی صفائی بھی کر دیا کرتا تھا۔ پیکر نے چہرہ پر سنجیدگی اور رعب لاتے ہوئے میرزا سے پوچھا! یہ سیب کہاں سے اٹھالائے ہو؟ ابراہیم مشہدی کے ٹھیلے سے! پیکر پہلے سے ہی ایسے موقع کے تلاش میں تھا میرزا کو ایک زبردست طمانچہ مار بیٹھا اور اس سے پہلے کہ میرزا سنبھلتے انکا گریبان پکڑ کر چلانے لگا۔ میں مفت خور وکاریگر نہیں چاہتا۔ اگر تمہیں سیب چاہئے تھا تو مجھ سے کہتے میں خود انتظام کرتا اس لب گور بوڑھے کو اذیت دیتے ہو۔ چلو اپنے کام پر لگ جاؤ!

میرزا جانتے تھے کہ پیکر انہیں ڈرانا چاہتا ہے ورنہ انہوں نے تو ابراہیم سے پوچھ کر ہی سیب اٹھایا تھا۔ اور پیکر کو بھی اس بوڑھے سے کوئی ہمدردی نہیں ہے اور نہ ہی حرام اور حلال کا مسئلہ اس کے پیش نظر تھا۔ وہ صرف انہیں مرعوب کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ

پیکر واقف تھا کہ میر زااور انکے بھائی محمد حرام اور حلال کی نسبت بہت حساس ہیں۔ موقع پر موجود کاریگروں نے میر زا کو تمسخر آمیز نگاہوں سے دیکھا لیکن کچھ بولنے کے بجائے سکوت کو ترجیح دی۔ان میں سے "احمد" جس کے تعلقات میر زا سے اچھے نہ تھے بول پڑا! ٹھیک ہوا ابھی آئے جمعہ جمعہ آٹھ دن نہ ہوا اور حرکتیں عرش اعلی پہ پہنچ گئیں۔ محمد نے صرف ایک حقارت بھری نگاہ میر زا پر ڈالی اور سر جھکا کر اپنے کام میں مشغول ہو گئے۔ میر زا ایک کنارے بیٹھ گئے اور ایک بڑی قینچی لے کر سب سے آسان کام یعنی انفنج کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے لگے۔ پیکر یہ معاملہ یہیں ختم کر دینا چاہتا تھا۔ وہ میر زا کی غیرت کو مزید ٹھیس نہیں پہونچانا چاہتا تھا۔ کیونکہ میر زا نے اپنی تند مزاجی پہلے ہی دن دکھا دی تھی۔ پیکر چاہتا تھا کہ میر زا پر آہستہ آہستہ پھندا کسے وہ خوب واقف تھا کہ ایسے آزاد مزاج آدمیوں کو کیسے مہار کیا جائے۔

کارخانہ کی مشینیں اتنی پرانی ہو چکی تھیں کہ اب ان سے عجیب و غریب آوازیں آنی شروع ہو گئیں تھی۔ درو دیوار اور کھڑکی کے شیشہ دھویں اور گندگی سے سیاہ ہو چکے تھے۔ جلی ہوئی ایک سیاہ کیتلی، چائے کی کچھ گندی پیالیاں، قند رکھنے کی ایک میلی اور گندی ٹوکری، کمرے کے گوشے گوشے میں آدھے کھائے ہوئے پنیر کے بکھرے ہوئے ٹکڑے گویا زبان حال سے اس کارخانہ کی کہانی کہتے ..... میر زا کی نگاہ میں یہ کارخانہ اب کارخانہ نہیں بلکہ ایک کباڑ خانہ تھا۔ اس دن بھی میر زا نے سب سے پہلے کام سے ہاتھ روک لیا لیکن وہ کارخانہ میں ہی رکے رہے وصبح کے واقعہ کے بعد وہ پس و پیش میں تھے کہ اس دن کی مزدوری کیسے لیں۔ انکی غیرت پیکر سے روبرو ہونے میں مانع ہو رہی تھی ایک بار سوچا کہ اپنے بھائی محمد سے کہیں لیکن پھر رک گئے۔ وہ جانتے تھے کہ محمد کے پاس بھی

پیسہ نہیں ہے۔ آخر کار پیکر کے کمرے کی طرف چل پڑے۔ لیکن ٹھیک اسی وقت پیکر وہاں آپہنچا۔ پیکر اچھی طرح جانتا تھا کہ شام کے وقت میر زا کن کاموں میں مصروف رہتے ہیں اور مزدوری کے پیسوں کا اکثر حصہ کہاں صرف کرتے ہیں۔ پیکر آگے بڑھا اور میر زا کو اشارے سے اپنے کمرے کی طرف آنے کو کہا۔

اگر اپنے بارے میں سنجیدگی نہیں اختیار کروگے تو گھاٹا اٹھاؤگے۔ اب بچپنا چھوڑ دو یہ شاموں کو کس چکر میں پڑے رہتے ہو۔ کیوں اپنے مستقبل کے بارے میں نہیں سوچتے۔ خود کو منظم کرو۔ اچھا محمد سے ناراض تو نہیں ہو۔

میر زا نے جو سر جھکائے کھڑے تھے نحیف سی آواز میں جواب دیا۔ نہیں!

پیکر نے ان سے کہا اچھا تو ٹھیک ہے جاؤ کام کرو۔ میر زا اسی حالت میں اپنی جگہ کھڑے رہے۔

کیا چاہتے ہو؟

میر زا نے کہا مزدوری!

اس پر پیکر نے کہا لیکن تمہاری ماں نے مجھے قسم دی ہے کہ میں تمہیں کوئی رقم نہ دوں۔

اس پر میر زا بولے۔ آپ ہر روز میری مزدوری کا پندرہ ریال انہیں دے دیا کیجئے جس سے گھر کا خرچہ چلے مین اور زیادہ محنت سے کام کرونگا۔ یہ سن کر پیکر خوش ہوا لیکن میر زا پر اپنی خوشی ظاہر نہ ہونے دی۔ پیکر نے میر زا کی پیش کش کو قبول کر لیا۔ وہ سوچ نہیں سکتا تھا کہ اتنی آسانی سے میر زا کو رام کر سکے گا۔ اس نے شفقت بھرے لہجے میں کہا! میرے بیٹے میں چاہتا ہوں کہ تم خود اپنے آپ کو منظم کرو۔ میں تمہارے خاندان

کے اقتصادی بحران سے اسی وقت سے باخبر ہوں جب تم لوگ بروجرد سے یہاں تہران آئے تھے۔ تم کو دوسروں سے زیادہ محنت کرنی ہے تا کہ تمہاری ماں کچھ آرام کر سکے۔ اگرچہ تمہاری عمر کے نوجوانوں کے لئے تفریح بھی ضروری ہے لیکن اتنی زیادہ نہیں کہ کام کو پس پشت ڈال دیا جائے۔ اگر تمہارے پاس پیسہ ہے تو ہر چیز ہے۔ میرزا اگرچہ پیکر سے راضی نہ تھے لیکن اسکی خیر خواہانہ باتوں کے سامنے گویا تسلیم ہو گئے۔

پیکر نے دراز کو اس طرح کھینچا کہ اس میں رکھے ریالوں کو میرزا ضرور دیکھ لیں پھر اس میں سے دس دس ریال کے دو سکے نکال کر میرزا کی طرف بڑھا دیا۔ اس طرح پیکر خود کو عادل، رحم دل اور محنتی تاجر کے عنوان سے پیش کرنا چاہتا تھا۔ اس کے کارخانہ میں کام کرنے والے ابھی تک یہ نہیں جان سکے تھے کہ ان کی آمدنی کے اور بھی ذرائع ہیں یا صرف یہی کارخانہ وہ تو پیکر کی شخصیت سے اچھی طرح واقف بھی نہیں ہو سکے تھے۔ میرزا کہتے تھے کہ وہ شیطان کو بھی درس دیتا تھا۔ اسی لئے میرزا کے منھ سے ایک دم نکل گیا! تم تو دوسروں کے ضمیر کی قیمت لگا بیٹھتے ہو۔

پیکر نے کہا! کیا کہا میں نہیں سمجھا۔

میرزا کو خوشی ہوئی کہ وہ انکے جملے کا مطلب نہ سمجھ سکا اور کہنے لگا میں نے آپ کا شکریہ ادا کیا انشاءاللہ یہ پیسے ادا کر دوں گا۔ اس پر پیکر بولا! یقیناً تم یہ کر سکتے ہو! اس بات پر تم قادر ہو میرے بیٹے۔

میرزا خود اپنی آنکھوں سے نکلے ان قطروں کا مفہوم نہیں سمجھ سکے جو صبح پیکر سے مار کھانے کے بعد جاری ہوئے تھے جس پر کسی کی نظر پڑنے سے پہلے ہی میرزا نے خشک کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ انکے بھائی احمد بھی اس سے آگاہ نہ ہو سکے تھے۔ وہ کیوں

روئے؟ یہ اشک درد و غم کے تھے یا یہ یتیمی اور دربدری کا رنج تھا جو آنکھوں کے ذریعہ اشک بن کے ابل پڑا تھا یا پھر یہ عزت نفس کے مجروح ہونے کا احساس تھا۔

ابھی چند گھنٹے بھی نہیں گزرے جب پیکر نے ان کی اہانت کی تھی اور وہ اس وقت اسکا احسان لے رہے تھے۔ پیکر برسوں سے انہیں مزدروں کے کے بل بوتے اپنا کارخانہ چلا رہا تھا اور انہیں کو جب چاہتا زدوکوب بھی کرتا رہتا۔ استحصال کی یہ عمارت ان چند سکوں کی بنیاد پر قائم تھیں جس کے سہارے یہ غریب اپنی زندگی کی پنچر گاڑی ڈھکیلنے پر مجبور تھے۔ دن رات لگاتار سخت محنت کے باوجود ان کی آمدنی اٹھنی خرچہ روپیہ تھا۔ اس وقت پیکر حساب کتاب میں مصروف تھا اور میرزا اسکے سامنے بیٹھے ہوئے اسکی مدد کر رہے تھے۔ چند دنوں پہلے لئے قرض کی وجہ سے میرزا پوری طرح پیکر کے احکامات پر عمل پیرا ہونے پر مجبور تھے۔ پیکر اس بات پر ہر گز راضی نہیں تھا کہ وہ اپنے گھر کو چھوڑ کر کسی اور کی دستگیری میں لگے۔ اس لئے اکثر وہ میرزا کو نصیحت کرتا۔ تم کامیابیاں حاصل کر سکتے ہو لیکن شرط یہ ہے کہ میری بات غور سے سنو اور سمجھو! لیکن فقیرانہ زندگی کے سلسلہ میں پیکر اور میرزا کے نظریوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ میرزا اس کم سنی میں بھی بہت سی باتوں کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ اگرچہ وضاحت اور تفصیل کے ساتھ ان مطالب کو پیش کرنے پر قادر نہیں تھے۔ میرزا گویا تیز تلوار تھے جو کہاں کام آئے اس کی خبر نہ تھی۔ بقول پیکر وہ دوسرے کاریگروں کی طرح شمشیر کند نہ تھے جو صبح سے شام تک سر جھکائے محض گدوں کی سلائی میں لگے رہیں۔ پیکر کے سامنے میرزا ایک معما تھے وہ بارہا سوچتا کیا وہ اس تیز تلوار سے فائدہ اٹھا سکے گا؟ اور اگر ہاں تو کس طرح؟

میرزا کی مظلومیت

وہ کافی دیر سے پیدل چل رہے تھے اتنا کہ شاید اب تھکاوٹ بھی پیچھے چھوٹ گئی تھی۔ سامنے ایک ایسا گھر نظر آرہا تھا جہاں ان کے لئے سکوں کا سامان مہیا تھا۔ انکے قدم بے اختیار اسی جانب بڑھ گئے۔ موسم سرما کی شدید ٹھنڈی ہواؤں کے درمیاں گرم آرام دہ کمرے سے بہتر کیا ہو سکتا تھا۔ وہ کمرہ کو گرم کرنے کے لئے گیس سے جلنے والی بخاری کے نزدیک بیٹھ گئے۔ گویا اپنے اطراف بالکل بے خبر اپنے کو گرم کرنے میں مشغول ہو گئے۔ فاطمہ چائے کی سینی اٹھائے آئی اور ان کے سامنے رکھ دیا۔ میرزا شفقت کے ساتھ فاطمہ کو دیکھ رہے تھے۔ فاطمہ بولی خالہ آج یہیں تھیں آپ کے بارے میں بہت پریشان تھیں۔ میرزا سوچنے لگے کہ اس گیارہ سالہ بچی کو کیونکر اس ظالم دنیا کے مسائل سے آگاہ کریں جہاں وہ خود اپنی زندگی کو آراستہ نہ کر سکے۔ یقیناماں شدید پریشانیوں کے باعث انکی خالہ اور خالو سے مدد طلب کرنے آئی تھیں۔

انہوں نے فوراًیہ فیصلہ کیا کہ اب وہاں سے چلے جائیں خالو کی نصیحتوں کو سننے کی تاب ان میں نہ تھی۔ اس کے علاوہ اس گھر کا اتنا زیادہ قرضہ ان کے سر پر تھا کہ وہ گھر کے مالک سے ذرہ برابر بھی بے مروتی نہیں کر سکتے تھے۔ اور اب خالہ کا سکوت انکی سمجھ میں آگیا تھا وہ سوچنے لگے۔ علی صاحب (خالو) نہ جانے کیا فیصلہ کریں۔ وہ میرزا کا ہمیشہ خاص احترام کرتے اور یہی بات میرزا کو مطمئن کر دیتی۔ میرزا نے سوچا شاید اس بار پھر وہ ہمارے ساتھ مہربانی کریں گے۔ وہ ماں کی طرح نہیں سوچتے۔ اگرچہ میرزا چاہتے تھے کہ کسی بھی طرح ماں کے لئے ثابت کر دیں کہ وہ ایک لحظہ بھی ان کی یاد سے غافل نہیں ااور

ان کی تمام تر سعی و کوشش یہی تھی کہ ماں کو راضی رکھیں اور ساتھ ہی ساتھ وہ یہ چاہتے تھے کہ ماں ان کے بارے میں پریشان نہ ہو۔ کیونکہ وہ بخوبی اپنی حفاظت کر سکتے ہیں۔

میرزا اس بات سے رنجیدہ نہ تھے کہ ان کی ماں علی خالو سے ان کے بارے میں تشویش کا اظہار کرتی ہے۔ علی خالو ایسے آدمی نہیں ہیں جو گلی کوچوں میں ایسی باتیں کرتے پھریں۔ وہ اگر آگ کو پانی سے مہار نہیں کر پاتے تو اس پر خاک ڈال کر اپنی حد تک اسے بجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ میرزا ان معاملات کی رو سے سلطنت خالہ کے گھر نہیں گئے تھے لیکن اب حالات ایسے ہو گئے تھے کہ خالو سے بات نہ کرنا ممکن نہیں تھا۔ میرزا خیالات میں کھوئے ہوئے تھے اور ان کی نگاہ فاطمہ کے چہرے پر تھی آٹھ سال سے وہ ایسی صورت کو اپنے خیالوں میں بن رہے تھے کہ سلطنت خالہ کی آواز نے انہیں خیالات کی دنیا سے باہر کھینچ لیا۔ خیریت تو ہے میرزا بہت رنجیدہ دِکھ رہے ہو! کیا ہوا کہاں سے آرہے ہو! خالہ مد نظر موضوع کو چھیڑنا چاہ رہی تھیں لیکن میرزا نے ہوشیاری سے بات کا رخ پلٹتے ہوئے پوچھا! کیا آج کل علی خالو کے پاس بالکل وقت نہیں ہے؟ ہم لوگوں کی کوئی خبر ہی نہیں لیتے۔ خالہ ان کے پاس آکر بیٹھ گئیں لیکن خاموش ہی رہیں۔ وہ جانتی تھیں کہ ان کے بات کرنے کا کوئی اثر میرزا پر نہیں پڑے گا۔ شاید ناراضگی جتا کر میرزا کو احساس دلا سکیں کہ ان کے بارے میں وہ لوگ کس قدر فکر مند ہیں۔ وہ خوب جانتی تھیں کہ میرزا ذہین اور بہت حساس ہیں۔ وہ اپنا ردعمل فوراً ہی ظاہر کر دیتے ہیں۔ میرزا کھڑے ہو گئے اور اس چھوٹے سے کمرہ میں ہی چہل قدمی کرنے لگے اس طرح وہ خود پر زیادہ قابو پا سکتے تھے۔ میرزا کی دور اندیشی اور تیز ہوشی کا جواب نہ تھا۔ خالہ نے حالات قابو میں رکھنے کے لئے کمرہ سے نکل جانا بہتر سمجھا اور جاتے جاتے فاطمہ کو ساتھ آنے کا اشارہ کر گئیں۔ میرزا

کمرے کی دیوار سے جڑے قد آدم آئینہ کے سامنے کھڑے ہوگئے۔ زنگ آلود فریم مختلف جگہوں سے ٹوٹ گیا تھا، آئینہ میں جابجا سیاہ دھبے پڑ گئے تھے۔ اس آئینہ سے میرزا کی آشنائی آٹھ برس پرانی ہو چکی تھی وہ شیشہ کو تک رہے تھے اور ان کی نگاہ ماضی کو دیکھ رہی تھی۔ ایک آٹھ سالہ بچہ مسکراتا ہوا داخل ہو رہا ہے آتے ہی اس نے سلام کیا۔ آفتاب کی تمازت نے اسکے چہرے کا رنگ بدل دیا ہے۔ بال نسبتاً لمبے اور الجھے ہوئے ہیں گرد و غبار سے اٹا لباس طولانی سفر کی گواہی دے رہا ہے۔ راہ کی تھکن اس کے چہرے سے صاف طور پر پڑھی جاسکتی ہے اسکے ساتھ چند افراد پر مشتمل ایک چھوٹا سا کارواں ہے جو اس بچے کی ہی طرح حالات کا مارا اور آسمان کا ستایا ہو ہے۔ یہ لوگ اپنی اپنی حد تک سامان زندگی اپنے کاندھوں پر لادے ابھی ابھی یہاں پہونچے ہیں۔ سب کو تھوڑے آرام کی فکر ہے لیکن بچہ آنگن میں کھیلنے لگا۔ آنگن کے ایک کونے میں پڑی پلاسٹک کی گیند نے اسکی ساری توجہ اپنی طرف مرکوز کرلی۔ یہ پہلی مرتبہ ہے کہ وہ گیند دیکھ رہا ہے آگے بڑھ کر وہ گیند کو اٹھا لیتا ہے۔ "درہ گرگ" میں تو اسنے کھیل کی ایسی کوئی چیز دیکھی بھی نہ تھی۔ وہاں صرف گلی ڈنڈے کا رواج تھا۔ اس وقت آنگن میں کوئی اور موجود نہیں تھا۔ دوسرے کرایہ دار اپنے اپنے کمروں میں کھانا کھانے میں مشغول تھے۔ بچہ گیند کو ادھر اُدھر اچھالنے لگا اسے پرواہ نہ تھی کہ گیند کہاں جارہی ہے کہ تبھی ایک عورت اپنی چادر کمر میں لپیٹے چیختی چلاتی بچہ کی طرف جھپٹی اور اس سے گیند چھین کر ایک طرف پھینک دیا۔ آٹھ سالہ بچہ سہم گیا اور دیوار سے لگ کے خاموشی سے وہ عورت کو دیکھ رہا تھا۔ اے سلطنت بانو کہاں مر گئی! گھر کو مسافر خانہ بنا دیا ہے تمہارا شوہر جاتا ہے اور پورے گاؤں کو مہمان بلا لاتا ہے ارے اس آدھے بالشت کے کمرہ میں کہاں سمائں گے، بچوں کو تو قابو میں رکھو ارے بھری دوپہر میں

کوئی کھیلنے کا وقت ہے ؟۔ یہ کہہ کر عورت نے اپنے طرف کا دروازہ زوردار آواز کے ساتھ بند کر لیا۔ بچہ ابھی تک آنگن میں ایک طرف سہما کھڑا رہا۔ وہ نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ یہ سب کیا ہوا۔ آٹھ سال سے گاؤں میں صبح شام آزادانہ پھرا کرتا تھا کوئی کچھ کہنے ولا نہ تھا۔ اسکی ماں علی الصباح جو دوسروں کے گھر کام کرنے جاتی تو عصر تک اسکا کوئی پتہ نہ رہتا۔ سورج ڈوبنے سے کچھ دیر پہلے دن بھر کی تھکاوٹ اور لوگوں کی ڈانٹ پھٹکار کا غازہ چہرے پر سجائے کچھ عدد روٹیاں لئے وہ گھر آتی۔ سارا دن کام کرنے سے آئی خستگی اسے مہلت نہ دیتی کہ کھانا کھلانے کے علاوہ وہ بچوں پر مزید توجہ دے۔

میرزا نے آئینہ پر اپنا ہاتھ پھیر شاید وہ ماضی کی تلخ یادوں سے چھٹکارا پانا چاہتے تھے۔ آئینہ اور شفاف ہو گیا اور میرز کے لئے ماضی کے نقوش اور گہرے ہو گئے ا ایک بار پھر انھوں نے دیکھا وہی بچہ اپنے گھر والوں کے ساتھ اپنا سامان لئے اس گھر سے رخصت ہو رہا ہے۔ اس آئینہ میں وہ کئی بار اپنا ماضی دیکھ چکے تھے۔ تبھی انہیں آئینہ میں علی خالو کی مسکراتی ہوئی صورت نظر آئی جس نے انکے تصورات کا تار توڑ دیا۔ علی آقا کی مسکراہٹ نے اس آٹھ سالہ بچہ کو کچھ اطمینان پہنچایا تھا۔ وہ لوگ تہران آئے تھے تاکہ گاؤں کی سختیوں اور پریشان حالیوں سے چھٹکارہ پاسکیں۔ لیکن یہاں تو اب کوئی راہ ہی نہیں مل رہی ہے۔ دربدری کی زندگی نے بارہا بار کرایہ کے گھروں کو بدلنے پر مجبور کیا تھا۔

یہ غربت زدہ بچہ استعمال شدہ پرانی کتابوں اور کاپیوں کے ساتھ صحن میں پڑے ایک بوسیدہ تخت پر بیٹھا اپنی مشقیں حل کر رہا ہے۔ اسکا قلم چل رہا ہے لیکن اسکا دل کہیں اور ہے۔ اسی لئے بارہا آنکھیں بھی کاپی سے ہٹ کر اپنی ماں، بھائی اور بہنوں کی طرف اٹھ جاتی ہیں۔ یہیں وہ وقت ہوتا ہے جب کاغذ پر اسکا قلم حروف کے بجائے اسکے استاد کے

بقول ایات زندگی لکھتا ہے جس سے عام انسان پڑھنے سے قاصر ہے۔ اس پر اسے خوب ڈانٹ پڑتی کیوں کہ دیکھنے والوں کے لئے وہ آڑی ترچھی لکیروں سے زیادہ اور کچھ نہ ہوتی۔ اسکے استاد تعجب کرتے تھے کہ یہ بے نظم بچہ امتحان میں اچانک اچھے نمبر کیسے لے آتا ہے۔ املا 95، ریاضی 75، مضمون نگاری 90، تاریخ 90، جغرافیہ 90 وغیرہ وہ ناظم اسکول کے سمجھ میں نہ آتا کہ اس بچہ کا کیا کیا جائے۔ بچے کا مظلوم چہرہ انہیں ایسا متاثر کرتا کہ اسکی شیطانیاں، تاخیریں اور غیر حاضریوں کو نظر انداز کر جاتے اور نظم و ضبط میں بھی اسے اچھے نمبر دے دیا کرتے تھے۔

لیکن بسا اوقات اسکا دیر سے آنا اس حد تک ہوتا کہ ناظم اسکول صبر نہ کر پاتے اور انکی ماں کو بلا بھیجتے۔

آج صاحبزادے دس بجے اسکول آئیں ہیں۔ کل تو آئے ہی نہیں تھے، آج زحمت کر بھی لی تو کلاس میں سو رہے تھے.

بچہ کو لب کشائی کی اجازت نہ تھی، وہ کیسے کہہ دیتا کہ چھٹی کے بعد دیر رات تک وہ کام کرتا ہے۔ ماں کو بھی لاج رکھنی تھی وہ بھی کبھی نہ کہہ سکی کہ اس کا دس سالہ بیٹا روزآنہ دس گھنٹے کام کرتا ہے تاکہ 10 ریال کما سکے۔ نتیجۃً اس بچے نے اپنی تاخیروں کا کوئی سبب بتانے کے بجائے اسکول چھوڑنے کو ترجیح دی اور اسکول جانا ترک کر دیا۔

میرزا کا دل اس بچے کے لئے بھر آیا اور امڈتے آنسوؤں نے آئینہ کو دھندلا دیا پھر جب میرزا نے اپنے اشک صاف کئے تو اب انہیں آئینہ میں ایک سولہ سالہ نوجوان نظر آرہا تھا۔ نکلتا ہوا قد، مرتب بال اور سفید قمیص میں ملبوس اس نوجوان پر اب بچہ کا اطلاق ہر گز نہیں ہو سکتا تھا۔ تبھی آئینہ میں علی آقا کی تصویر نظر آتی یکلخت میرزا علی کی طرف بڑھے اور ان

کے گلے سے لپٹ گئے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے انہوں نے دیکھا کہ ان کی ماں اور خالہ بھی وہیں موجود ہیں اسی دوران فاطمہ کمرے میں داخل ہوئی اور میرزا نے اپنے گریہ کا گلا گھونٹتے ہوئے ماں سے کہا ! آیئے چلئے ...... ہاں بیٹا چلو ! ماں نے ڈھیلی آواز میں جواب دیا۔

میرزا کی شادی

عسکرآباد کی گلیاں تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھیں اطراف کے چھوٹے چھوٹے مکانوں سے کھڑکیوں کے راستہ ہلکی ہلکی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ کچھ عرصہ پہلے یہ بیابان تھا پھر جس سے بھی ممکن ہوسکا کچی اینٹوں سے ایک دو کمرے بنالئے پھر چہار دیواری کھینچ کر رہنے لگے۔ علی آقا نے بھی دو ہزار تومان میں ایک زمین خرید لی تھی اور تین ہزار تومان خرچ کر کے دو کمرے بنا ڈالے تھے۔ عسکرآباد کی آبادی اسی طرز پر روز آنہ بڑھتی چلی جارہی تھی۔

آقا عبداللہ بس سے اتر کر باقی ماندہ راستہ پیدل ہی علی آقا کے گھر کی طرف چل پڑے۔ اسی اطراف کے مکانوں میں ابھی تک بجلی نہیں پہونچی تھی۔ علی آقا نے ایک لالٹین جلا کر رکھ دی تھی آقا عبداللہ وہاں پہنچے سب سے پہلے میرزا نے بڑھ کر انکا استقبال کیا۔ آقا عبداللہ نے انہیں گلے سے لگالیا۔ انکے چہرہ پر ہلکی میٹھی مسکراہٹ تیر رہی تھی۔ وہ بولے خدا مبارک کرے، میرزا خاموش رہے۔ ہاتھ سے بیٹھنے کیلئے اشارہ کیا۔ آنگن میں

ایک طرف فرش بچھایا گیا تھا کچھ لوگ وہاں شمع کی روشنی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ آقا عبداللہ بھی انہیں کے بیچ جا بیٹھے مہمانوں کی تعداد دو ہندسوں تک نہیں پہونچتی تھی۔ میرزا کے بھائی محمد عبدا••• احمد اور انکے ماموں حسین کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ دوستوں میں سے صرف شقافی حاضر تھے۔ دو تین نزدیکی رشتہ دار بھی شریک ہو گئے تھے۔ علی آقا کی اقتصادی حالت ایسی نہ تھی کہ دوسری شادیوں کی طرح وہاں بھی شان و شوکت کے سامان مہیا کرتے۔ شاید میرزا کے علاوہ کوئی دوسرا اتنی سادگی سے شادی کرنا پسند نہ کرتا۔ ان کی ماں نے بھی کوئی مطالبہ نہیں کیا تھا۔ شاید کوئی پسند نہ کرتا کہ اس طرز کے جشن میں کسی کو مدعو کرے۔ لیکن وہ میرزا تھے جنہیں ایسی باتوں کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ علی آقا کالڑکا ہاتھ میں چائے کی سینی لئے مہامانوں کی ضیافت کر رہا تھا۔ خواتین کمرے میں جمع تھیں انکی تعداد مردوں سے زیادہ تھی۔ وہ روزمرہ کی گفتگو میں مصروف تھیں۔ میرزا کی ماں بہت مسرور تھیں شاید وہ سوچ رہی تھیں کہ اب میرزا دوبارہ کام پر جانے لگیں گے۔ اور سیاسی سرگرمی سے دست بردار ہو جائیں گے۔ مہمان کے سامنے تیسری بار مٹھائیاں پیش کی جارہی تھیں۔ مٹھائی اور چائے کے علاوہ پھل بھی موجود تھے۔ دونوں کمروں میں چراغ جل رہے تھے۔ دلہن معمولی کپڑے پہنے ہوئے لیکن بہت مطمئن اور بے انتہا خوش حجلۂ عروسی میں بیٹھی تھی۔ فاطمہ جب بھی کمرے میں رکھے معمولی اثاثہ پر نگاڈالتی تو اسے میرزا کا یہ جملہ یاد آجاتا میں خود اس باتوں کا جواب ہوں اور فاطمہ مطمئن ہو جاتی۔

یااللہ! علی آقا کی صدا آئی اور خواتین سنبھل کر بیٹھ گئیں چادریں پھر سے صحیح کی جانے لگیں۔ پہلے علی آقا اور پھر عبداللہ کمرے میں داخل ہوئے میرزا پہلے تھوڑے رکے پھر کمرے میں داخل ہوئے۔ عورتوں نے دلہن کے دونوں جانب جگہ چھوڑ دی۔ وہ

لوگ بیٹھ گئے۔ آقا عبداللہ نے خطبہ عقد پڑھنے سے پہلے میرزا کے مطمئن چہرے کی جانب غور سے دیکھا اور اس رات کے میرزا یاد آ گئے جب وہ نہج البلاغہ سے متقین کی صفات بیان کر رہے تھے تو میرزا کا چہرہ، خوف، حیرانی اور اضطراب و بے چینی کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ آقا عبداللہ کے لئے یہ شادی ایک خواب تھی وہ ایسے محسوس کر رہے تھے کہ میرزا سے ان کی محبت مزید بڑھ گئی ہے اس دولہے اور دلہن کا مستقبل کیسا ہوگا یہ ایک سوال تھا۔ دولہا جسکے سنہرے بال زمانے کی سختیاں سہتے سہتے اپنی چمک کھو بیٹھے تھے۔ دو سال پہلے اپنے نوجوان دوستوں کے ساتھ ان کے طرز مزاح اور شوخیوں میں نمایاں تبدیلی آ گئی تھی۔ آج جب وہ عقد کے لئے حاضر ہوئے تو اس آزاد منش کے کندھے مزید ذمہ داریاں اٹھانے کے لئے آمادہ دکھ رہے تھے۔ سنجیدگی نے آنکھوں میں پائی جانے ولی شوخی چھین لی تھی۔ ہمیشہ مطمئن نظر آنے والا یہ شخص آج مضطرب نظر آرہا تھا۔

بسم اللہ کیجئے...

عقد ہوتے ہی عورتوں میں خوشی کا غلغلہ اٹھا۔ ماں نے مٹھائی کا برتن ابراہیم کو دیا تاکہ وہ اپنے بھائی کے عقد کی مٹھائی تقسیم کرے۔ میرزا وہاں سے اٹھ کر صحن میں مردوں کے درمیان چلے آئے۔ ماں نے اسپند کے دھوئیں سے کمرہ بھر دیا تھا۔ دوسرے کمرے میں فاطمہ کا جہیز رکھا گیا تھا۔ ایک قالین جو اس نے اپنی بہن کے مدرسے میں بنا تھا۔ یہ واحد ایسا قالین تھا جو اس گھر میں تیار کیا گیا لیکن فروخت نہیں کیا گیا۔ تھوڑا بہت برتن، کچھ چادریں اور گدے اور ایک الماری اور معمولی قسم کی دوسری چیزیں اور۔۔۔ سلطنت بیگم کو اپنا داماد جو خود کے خریدے ہوئے سفید شرٹ اور پینٹ میں ملبوس تھا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ انہوں نے میرزا کی پیشانی کا بوسہ لیا اور کہا! میں تم دونوں کو خدا کے حوالے کرتی

ہوں۔ میرزا جب صحن میں پہونچے تو دونوں بھائیوں نے بڑھ کر انہیں گلے لگا لیا۔ محمد اس وقت سوچ رہے تھے کہ کیا اب میرزا اپنی سیاسی سرگرمی سے باز آجائیں گے۔ شادی کے وقت میرزا کی عمر انیس سال ہو چکی تھی

آقا کے اعلانات

اذان کی آواز سنتے ہی میرزا نے آستینوں کو اوپر چڑھایا اور حوض کی طرف چل پڑے ٹھیک اسی وقت "امیر" کارخانہ میں داخل ہوئے امیر بڑی عجلت میں لگ رہے تھے ان کے چہرے پر موجود پریشانی کے آثار دیکھ کر میرزا کا فکر مند ہونا لازمی تھا کیا بات ہے؟ امیر اور ان کے دوسرے ساتھیوں کو انہوں نے ہدایت دے رکھی تھی کہ ان سے ملاقات کے لئے کارخانہ میں نہ آیا کریں۔ "امیر" تو خود ہی دوسروں کو ایسی غلطی سے دور رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ "آقا عبداللہ" نے انہیں خاص طور پر آگاہ کیا تھا کہ مسجد کے علاوہ وہ لوگ کہیں یکجا نہ ہوں۔ جب سے "آقا" کے اعلانات والے اشتہارات کی ذمہ داری انہوں نے لی تھی صرف مسجد میں ہی اس موضوع پر بات ہوتی۔ اس کام کو پوری رازداری سے انجام دینا ضروری تھا کب کہاں "ساواک" کے آدمی سادہ لباس میں موجود ہوں کیا معلوم؟ ابھی پرسوں جو اشتہارات امیر کے سپرد کئے تھے تاکہ وہ تھوڑی تھوڑی مقدار میں ساتھیوں تک پہونچائیں۔ سنا کہ اس سلسلہ میں کوئی مسئلہ پیش آگیا تھا پتا نہیں اسمیں کہاں

تک سچ ہے اور کہاں تک جھوٹ ؟ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ امیر نے وہ اشتہارات خود ہی غائب کر دئے ہوں ؟ وہ سوچ رہے تھے کہ آقا عبداللہ کو کیا جواب دیں گے ؟ ابھی دو مہینے پہلے ان سے ملاقات ہوئی تھی اور چند دن ہی گزرے تھے کہ انہیں ہم لوگوں پر اعتماد ہو سکا تھا۔ انہوں نے اشتہارات کے سلسلہ میں خاص توجہ دینے پر بڑی تاکید کی تھی ساتھ ہی یہ بھی کہا تھا کہ ہمارا رویہ اور معاشرت میں فرق نہیں آنا چاہئے۔ سب اپنے اپنے کاموں پر پہلے کی طرح مشغول رہیں تاکہ کسی کو شک نہ ہو۔ فی الحال "آقا" کے لئے جو کام بھی کیا جاتا ہے سری اور پوشیدہ طور پر ہی انجام دینا ہے۔ اس وقت تک میرزا کے سات افراد تھے جن پر بڑی گہری نگاہ رکھنے کے بعد میرزا نے اعتماد کیا تھا۔ اور اب وہ آقا عبداللہ کے توسط سے "آقا" کے لئے کچھ کر سکتے تھے۔ "آقا عبداللہ" نے میرزا سے ایک آدمی کا تعارف کرایا تھا اور یہ طے ہوا تھا کہ وہ "کوچہ مرغی ھا" کے آس پاس میرزا سے ملاقات کرے گا اور وہیں اشتہارات میرزا کے سپرد کئے جائیں گے۔ آج سے دو روز قبل وہ شخص معینہ جگہ پر ملا تھا اور میرزا کو ایک پیکٹ تھما کر بڑی تیزی سے "مولوی روڈ" بازار کے مجمع میں غائب ہو گیا تھا اور اس طرح میرزا انقلاب کی تحریک سے جڑ گئے لیکن یہ بات ابھی ان کے رشتہ داروں اور قریبی دوستوں سے بھی پوشیدہ تھی۔ میرزا بخوبی واقف تھے کہ یہ کام نہایت خطروں بھرا ہے لیکن انہوں نے اپنے ملک اور دین کے لئے کچھ کر گزرنے کی ٹھان ہی لی تھی امیرا کی سانیس تیزی سے چل رہی تھیں۔ میرزا مجسم سوال بنے ان کے سامنے کھڑے تھے

کارخانے میں اس وقت سناٹا ہو گیا تھا مشینیں خاموش تھیں اور بقیہ کاریگر کھانا کھانے کے لئے "مشھدی اکبر" کے چائے خانے پر چلے گئے تھے امیر سانسوں پر قابو پاتے ہی بولے !

محلہ میں کچھ مشکوک لوگوں کی آمد و رفت ہے۔ کچھ افراد مسجد گلشن اور اطراف کی گلیوں میں ٹہل رہے ہیں جنکی ظاہری وضع و قطع سے ان کا ساواکی ہونا بعید نہیں لگتا۔

اشتہارات کا کیا کیا؟

وہ تو گھر پر ہے۔ لیکن جب میں گھر پہونچا تو ہوشنگ گھر پر موجود تھا مجھے اور پیکٹ کو بڑی عجیب نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ لگتا ہے بھانپ گیا ہے۔ میں نے وہ اشتہارات فی الحال تہ خانے میں چھپا دیئے ہیں۔ جب میں نے دیکھا کہ "ہوشنگ" کچھ پوچھنے پر آمادہ لگ رہا ہے تو میں نے اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں پھر صحن میں پڑے "فٹ بال" کو اس طرح سے مارا کہ وہ تہ خانہ میں چلا گیا گیند واپس لانے کے بہانے تیزی سے اندر گیا اور اشتہارات ایک جگہ چھپا دیا۔

میرزا بے ساختہ مسکرا اٹھے۔ میرزا کو متبسم دیکھ کر امیر کی گھبراہٹ کم ہو گئی۔ انہوں نے بھی وضو کرنے کے لئے آستینوں کو اوپر چڑھانا شروع کیا لیکن میرزا نے فوراً ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور بوے !

یہ نماز پڑھنے کی جگہ نہیں ہے۔ مسجد گلشن جاؤاور نماز پڑھنے کے بعد صرف قرآن پڑھتے رہنا۔ اپنے گھر کے اطراف بھی نہ جانا۔ اگر ساتھیوں میں سے کسی سے ملاقات ہو جائے تو ان سے کہنا کہ روزآنہ کی طرح اپنی مسجد میں ہی نماز پڑھیں۔ شقاقی سے کہنا کہ گھر پر ہی رکا رہے۔ "آقا کا رسالہ کہاں ہے یہ صرف اسے معلوم ہے" ہوشنگ کے ساتھ خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے رہو۔ مجھے امید نہیں ہے کہ اس نے مخبری کی ہو۔ ابھی تو یہ بھی نہیں معلوم کہ "ساواک" نے کیوں محلہ گھیر رکھا ہے یہ کہہ کر میرزا نماز میں مشغول ہو گئے۔ نماز میں میرزا کا خضوع و خشوع قابل دید ہوا کرتا۔ بارگاہ خدا میں کھڑے ہونے کے بعد وہ سب کچھ بھول جاتے۔ میرزا کا یہ انداز امیر کو ان کی اطاعت کرنے پر مجبور کر دیتا تھا۔ ساتھ ہی تیزی کے ساتھ فیصلہ کرنے کی صلاحیت اور بدلتے ہوئے حالات کا اطمینان اور خود اعتمادی کے ساتھ بہترین مقابلہ کرنے کی قابلیت نے ہی میرزا کو اپنے ساتھیوں میں ممتاز درجہ عطا کیا تھا۔ "پیکر" ہی کیا ان کے محلے کے دوست بھی کبھی یہ اندازہ نہیں لگا سکتے تھے کہ میرزا کا اگلا قدم کیا ہو گا۔

امیر جا چکے تھے۔ اور کارخانے میں کام کرنے والے کھانا کھانے کے بعد بلند آواز میں باتیں کرتے ہوئے لوٹ رہے تھے۔ میرزا کو نماز میں مشغول دیکھ کر سب نے چپ سادھ لی۔ یہ سب میرزا کا احترام کرتے اکثر ان کی محبت اور بعض ان کے خوف سے کاریگروں کے پیچھے ہی ایک شخص اور کارخانے میں داخل ہوا۔ دیکھنے میں پینتالیس سال کا

لگنے والا یہ شخص داڑھی اور ظاہری وضع قطع سے مذہبی آدمی لگ رہا تھا۔اِدھر اُدھر دیکھے بغیر وہ تیزی سے تیار شدہ گدوں کے اسٹاک کی طرف بڑھتا چلا گیا۔اس کا انداز بتا رہا تھا کہ جلدی میں ہے۔آقا میرزا اس نے آواز دی!

میرے گدے کہاں ہیں میں ذرا جلدی میں ہوں!

میرزا نماز پڑھ رہے ہیں۔احد نے جواب دیا تھا۔

کہاں؟

احد نے ہال کے ایک گوشے کی طرف اشارہ کیا۔

وہ ہیں!

وہ شخص عجیب نگاہوں سے میرزا کو دیکھنے لگا نہ جانے وہ کیا سوچنے لگا تھا۔اس کے چہرے پر ایسے آثار نمایاں تھے جیسے وہ کسی کشمکش میں مبتلا ہو گیا ہے میرزا سے کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن جھجھک رہا ہے۔میرزا کی نماز ختم ہو چکی تھی۔وہ میرزا کے پاس پہونچا ایک بار اطراف میں نگاہ کی صرف احد وہاں موجود تھا۔

نماز کے لئے مسجد کیوں نہیں جاتے؟

کام کچھ زیادہ ہے کئی "آرڈر" پورے کرنے ہیں!!

اس شخص نے ایک بار پھر اطراف پر نگاہ ڈالی اور جھک کر آہستہ سے بولا!

مجھے جہاں تک معلوم ہے یہودی کی ملکیت میں نماز پڑھنا صحیح نہیں ہے۔

میرزا نے متحیرانہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں سے اضطراب اور بے یقینی مترشح تھی۔ کیا پیکر یہودی ہے؟ وہ آج تک ایک یہودی کے لئے کام کرتے رہے ہیں؟ انہیں گویا اپنے کانوں پر یقین نہیں ہو رہا تھا۔ آج تک کسی نے انہیں کیوں نہیں بتایا کہ "پیکر" یہودی ہے۔ آج تک وہ پیکر کو صرف ایک محنتی تاجر کی شکل میں دیکھتے آئے تھے۔ میرزا نے آقا عبداللہ نے یہودیوں کی بین الاقوامی سازشوں اور ان کے استعماری منصوبوں کے بارے میں تفصیل سے سن رکھا تھا۔ ان کا ذہن تیزی سے پیکر کے مختلف سرگرمیوں کو معنی پہنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ پیکر کا سارا ہم و غم پیسہ کمانا تھا اگرچہ اس میں کچھ مثبت خصلتیں بھی پائی جاتی تھی میرزا سر جھکائے سوچتے رہے۔ میرزا کے ذہن ایک بار محلے کا محاصرہ کئے ہوئے ساواکیوں کی طرف چلا گیا۔ انہیں گھر پہنچنا بھی ضروری تھا۔ اب اس نئی اطلاع کے بعد وہ سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ کیا اچھی خاصی درآمد والے اس کام کو چھوڑ دیں؟ یا کیا یہودی کے یہاں کام کرنا صحیح ہے؟ میرزا نے کارخانہ کی وردی اتار کر اپنا لباس پہنا۔ احد کو آنے والے شخص کے گدوں کے بارے میں ہدایت دیتے

ہوئے کارخانہ سے باہر نکل آئے۔ پیکر کی نگاہ ان پر پڑی دفتر سے نکل کر تیزی سے ان کے قریب آیا اور بولا!

کہاں میرزا؟

میری ماں کو دل کی مریض ہے۔ انہیں اسپتال پہونچانا ہے۔ میرزا نے آہستہ سے کہا تھا وہ نہیں چاہتے تھے کہ "محمد" ماں کی بیماری سے آگاہ ہو پیکر ان کی ماں کی بیماری سے واقف تھا۔ بغیر کچھ کہے واپس اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔ میرزا نے اپنی موٹر سائیکل اسٹارٹ کی پرانی موٹر سائیکل انہوں نے قسطوں پر خرید رکھی تھی۔ ظاہراً تو کباڑا ہی لگتی تھی لیکن کام چل ہی جاتا تھوڑی دیر بعد ہی میرزا گھر جا پہنچے۔ میرزا نے دقُ الباب کیا۔ زینت خانم نے دروازہ کھولا تھا۔ میرزا نے صحن میں موٹر سائیکل کھڑی کی اور سیدھے ماں کے پاس جانے لگے۔ زینت خانم بولیں!

دو گھنٹے سے ساواکی گھر گھر کی تلاشی لے رہے ہیں خدا ہی رحم کرے۔

میرزا آپ سے تو کوئی حرکت سرزد نہیں ہوئی ہے؟

کیوں آج تو میں دن بھر کاموں میں بہت زیادہ مصروف تھا۔ آج میں نے کم از کم پچاس گدے تیار کئے ہیں۔

خدا جانے آپ کیا کرتے پھرتے ہیں۔ آخر کار ایک دن ہم لوگوں کی زندگی آپ برباد کریں گے۔

میرزا صرف مسکرا کر رہ گئے کچھ نہ بولے جس پر زینت خانم مزید چراغ پا ہو گئیں۔ یہ مذاق کا وقت نہیں ہے ان کی آواز کافی تیز ہو گئی تھی۔ ہوشنگ بھی اپنے کمرے سے نکل آیا اور ٹھیک میرزا کے سامنے آ کھڑا ہوا اور بولا!

میں کسی ایسے شخص کو نہیں جانتا جو آپ سے زیادہ قوی اعصاب کا مالک ہو۔ آپ جانتے ہیں میں ایک فوجی ہوں۔ اگر یہ گھر شک کے دائرہ میں آگیا تو میں کہیں کا نہیں رہ جاؤں گا۔ آخر آپ کیا چاہتے ہیں؟ ہم لوگوں کا خیال کیوں نہیں کرتے؟

ہوشنگ کا لہجہ تیز ہوتا چلا گیا تھا لیکن میرزا کی نرم نگاہوں کے سامنے ایک بار پھر ٹھنڈا پڑ گیا۔ ہمیشہ یہی ہوتا وہ جب بھی میرزا سے حتمی فیصلہ کرنے کے ارادہ سے سامنے آتا۔ میرزا کی محبت آمیز اور اطمینان سے جھکی نظریں اسے گویا اپنی اسیر بنا لیتیں اور وہ میرزا کی معصوم اور پر سکون نگاہوں کے سامنے بے دست و پا ہو جاتا اس کے سارے ارادے ٹھنڈے پڑ جاتے اور تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ جاتے پھر اس میں ہمت نہ ہوتی کہ میرزا پر آواز بلند کر سکے اگرچہ اس کے عقیدے کے مطابق میرزا کا تعلق یقیناً آشوب برپا کرنے والوں سے تھا۔ دو گھنٹے سے پولیس نے محلہ کو گھیر رکھا تھا آج ہی کیا اس سے پہلے بھی

ہوشنگ نے کئی بار ارادہ کیا کہ ساواک والوں کو "میرزا" اور "شقاقی" کی سرگرمیوں سے آگاہ کردے۔ لیکن وہ خود نہیں جانتا تھا کہ آخر کیوں اپنے ارادہ کو عملی جامہ نہیں پہنا پاتا۔ شقاقی بھی صحن میں نکل آیا تھا۔ میرزا سے مخاطب ہوا اور بولا!

آج اتنے پہلے ہی کیوں چلے آئے؟

میرزا سمجھ گئے کہ شقاقی نے بات کو بدلنے کے لئے یہ سوال کیا ہے بولے!

میرے سر میں درد ہے آرام کرنا چاہتا تھا لیکن آتے ہی جناب عالی کے عتاب کا شکار ہو رہا ہوں۔ میرزا نے ہوشنگ کی طرف اشارہ کیا تھا۔

تبھی چند دوڑتے قدموں کی آواز آئی جو قریب ہوتی جا رہی تھی۔ میرزا اور شقاقی تیزی کے ساتھ تہ خانے میں چلے گئے۔ ہوشنگ وہی کھڑا دیکھتا رہا۔ دروازہ پیٹنے کی آواز کے ساتھ ساتھ پولیس والوں کی آواز آئی جو فوراً نہ کھولنے پر دروازہ توڑ دینے کی دھمکی دے رہے تھے۔ "زینت خانم" نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے فوراً دروازہ کھول دیا۔ دو سادہ لباس پولیس والے تیزی سے گھر میں داخل ہوئے۔ ہوشنگ خود کو قابو میں رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ بولا!

سلام، کیا بات ہے سر؟

ہم گھر کی تلاشی لینے آئے ہیں۔

میں ایک فوجی ہوں۔

پولیس والوں نے ایک بار ہوشنگ کو اوپر سے نیچے تک دیکھا پھر اس سے شناختی کارڈ طلب کیا۔ ہوشنگ نے فوراً اپنا شناختی کارڈ ان کی طرف بڑھایا۔ ایک پولیس والا اس کے کارڈ کو دیکھ رہا تھا اور دوسرے نے ارد گرد پر نگاہیں ڈالنی شروع کر دی۔ دالان کے ایک کونے میں شاہ کی تصویر کا ایک پرانا فریم لگا تھا۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی وہ بولا !

اگر تخریب کاروں میں سے کوئی اِدھر آجائے تو آپ انہیں فوراً گرفتار کر کے ہمیں اطلاع دیجئے۔ ہم کافی دیر سے ان کا تعاقب کر رہے ہیں شاید کسی گھر میں چھپ گئے ہوں ہشیار رہئے گا۔

آپ سے مدد کی پوری امید ہے۔

آپ لوگ مطمئن رہئے یہ تو ہمارا وظیفہ ہے۔

دونوں پولیس والے گھر سے چلے گئے تو زینت خانم کی رکی ہوئی سانسیں چلنے لگی میرزا بھی تہ خانے سے باہر نکل آئے تھے۔ ہوشنگ انہیں عجیب نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ میرزا نے شکریہ کے بجائے سکوت اختیار کرنے میں عافیت سمجھی۔ پورے محلے میں

ہڑ بنگ مچی ہوئی تھی۔ محلہ کے آخر میں مولوی روڈ سے متصل گلی کے ایک گھر کو پولیس نے پوری طرح گھیر رکھا تھا سورج غروب ہونے والا تھا۔ میرزا گھر سے نکلے وہ یہ جاننے کے لئے بے چین تھے کہ ""ساواک"" کس کی تلاش میں ہے ؟۔ایک گلی کے موڑ پر محلہ کے کچھ افراد چہ میگوئیاں کررہے تھے۔ میرزا انہیں کی طرف چل دیئے۔ پولیس والے اب بھی اس گھر کو اپنے محاصرے میں لئے ہوئے تھے۔ یہ گھر میرزا کے لئے جانا پہچانا تھا۔ یعنی انہیں گرفتار کرنے آئے ہیں ؟ پھر ہم لوگوں کا کیا ہوگا ؟اگر ان سے ہمارا رابطہ کا پتہ ساواک کو چل گیا تو پھر ہم لوگوں کا بچنا بھی ناممکن ہوگا۔انہیں یقین نہیں ہورہا تھا۔ آقا عبداللہ کے گھر کا محاصرہ ! ؟ پھر میرزا نے سوچا شاید کوئی غلط فہمی ہوئی ہو۔ میرزا اپنے دل کو بہلانا چاہ رہے تھے لیکن اگلے ہی لمحے انہوں نے دیکھا کہ چند پولیس والے آقائی عبداللہ کو گھیرے ہوئے آگے بڑھنے کے لئے بار بار دھکا دے رہے ہیں۔ لیکن میرزا کو آقا عبداللہ کے چہرے پر اضطراب کی کوئی نشانی نظر نہ آئی وہ بڑے اطمینان سے آگے بڑھ رہے تھے۔ میرزا نے ایسے حالات میں بھی آقا عبداللہ سے ایک سبق سیکھا۔ جس وقت آقا عبداللہ لوگوں کے پاس سے گذر رہے تھے وہ کسی پر نگاہ نہیں کررہے تھے کہ کہیں ساواک والے اس شخص کو اپنے شک کے دائرے میں نہ لے لیں۔ میرزا نے بڑی مشقت سے خود کو قابو میں رکھا۔ان کے ذہن میں متعدد سوالات تھے کیا ایک دن ان کا انجام بھی آقا عبداللہ کی طرح ہوگا۔ بہر حال آقای عبداللہ کے بعد بھی وہ آقا کے بیانات کو اشتہار کی صورت میں

لوگوں تک پہنچا سکتے تھے لیکن انہیں یہ خوف تھا کہ اب "ساواک" والے کبھی بھی ان تک پہنچ سکتے ہیں۔ آقا عبداللہ کی "امانت" اب بھی میرزا کے پاس تھی جسے دینے سے پہلے انہوں نے کہا تھا "ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ آقا کی توضیح المسائل تم اپنے پاس رکھو۔" لیکن میرزا کے اصرار نے انہیں مجبور کیا تھا۔ میرزا ہر روز اسکا مطالعہ کرتے۔ کتاب کی سطروں کے درمیان وہ "آقا" کی تصویر تلاش کرتے۔ ان کی دل میں یہ تمنّا بار بار مچلتی اور وہ سوچتے کہ کیا کوئی دن ایسا آئے گا جب وہ "آقا" کو نزدیک سے دیکھ سکیں گے ؟

میرزا کی ذہانت

پیکر سے میرزا کا طنزیہ گفتگو کرنا اور اسے ترکی بہ ترکی جواب دینا کارخانہ کے مزدوروں کی آپسی گفتگو کا موضوع بنا ہوا تھا۔ میرزا کسی ایسے موقع کی تلاش میں تھے کہ پیکر کو ان سے معافی مانگنی پڑے۔ محمد کو اس بات کا خوف تھا کہ میرزا کو اور بہتر ملازمت نہ ملے۔ محمد بذاتِ خود زندگی کے اصولوں کے پابند تھے۔ اور وہ اسی فکر میں تھے کہ میرزا کو بھی اسی راہ پر لے آئیں گے کہ جن کا اٹھارواں سال پورا ہونے والا تھا۔ محمد گدوں کو ان کی جگہ منظم کرنے کے لئے سلائی مشین پر سے اٹھے تو دیکھا کہ میرزا انہیں تحسین آمیز نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ اس انداز نے محمد کو حیرت زدہ کر دیا وہ میرزا کے پاس جا کر بیٹھے اور بولے۔ یہ ملازمت چھوڑنا مناسب نہیں ہے۔ تم کو اسکے یہودی ہونے سے کیا سروکار؟ ریڈیو بند

کرنے پر کیوں ضد کرتے ہو؟ کاریگروں کو اچھا لگتا ہے کہ وہ کام کرتے وقت موسیقی سنتے رہیں... لیکن میں ایسے فحش گانے نہیں سن سکتا۔ آپ نے تو دیکھا ہے کہ میں ریڈیو بند کرانے میں کامیاب رہا۔ پیکر برداشت نہیں کر سکتا کہ کارخانہ ایک گھنٹے کے لئے بھی بند ہو تم پیکر کی مجبوری کا فائدہ اٹھانا چاہ رہے ہو۔ میرزا مسکرا کر دروازہ کی طرف دیکھا وہ بے صبری سے پیکر کا انتظار کر رہے تھے۔ آج وہ ایک ایسا منصوبہ بنا کر آئے تھے جس کے ذریعہ وہ ہمیشہ کے لئے پیکر کے شر سے محفوظ ہو جانا طے تھا۔ وہ اپنے بھائی سے بولے۔ دیکھئے آج تک جو بھی آپ نے کیا میں نے بے چوں وچرا سنا۔ آج آپ سے تقاضہ کرتا ہوں کہ اس سلسلہ میں میرا ساتھ دیجئے۔

انھوں نے گھبرا کے پوچھا کس سلسلہ میں؟

میں چاہتا ہوں کہ ایسا کام کروں کہ پیکر خود ہی مجھ سے چھٹکارا پانا چاہے۔

تمہاری مزدوری کا کیا ہوگا؟

اگر ان مسائل کو اہمیت دوں تو دوسری بڑی مشکلوں کو حل نہیں کر سکتا۔ اسی وقت پیکر کارخانے میں داخل ہوا اور میرزا کی طرف دیکھے بغیر سیدھے اپنے کمرے کی طرف چل پڑا۔ ہر روز ٹھیک دس بجے صبح 'مشہدی اکبر' چائے کی سینی اٹھائے پیکر کے کمرے میں پہنچاتا

تھا۔ جیسے ہی میرزا نے دیکھا مشہدی چائے لئے پیکر کے کمرے میں جارہا ہے انہوں نے محمد کا ہاتھ پکڑا اور تیزی سے پیکر کے کمرے میں داخل ہو گئے۔

ریڈیو کے بارے میں پیکر اور میرزا کے درمیان ہوئے جھگڑے کا اثر پیکر کے چہرہ پر دکھ رہا تھا۔ لیکن میرزا نے اسکی چڑھی ہوئی تیوریوں اور بگڑے چہرے کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ وہ پیکر کو دوبارہ غصہ دلانے کی فکر میں تھے۔ میرزا اچھی طرح جانتے تھے کہ پیکر سارا ہم و غم دولت کمانا ہے وہ اپنی منعفت کو خطرہ میں نہیں دیکھ سکتا۔ مشہدی اکبر نے حسب سابق محبت بھری نگاہ میرزا پر ڈالی۔ لیکن پیکر کے اکھڑے مزاج کو بھانپ کر وہ فوراً ہی الٹے پاؤں لوٹنے لگا۔

اے مشہدی اکبر! میرزا نے اسے آواز دی۔ مشہدی نے اپنا رخ صرف میرزا کی طرف کیا۔

میرزا نے پوچھا! تم کس مرجع کی تقلید کرتے ہو؟ مشہدی یہ سنتے ہی سناٹے میں آگیا۔ محمد نے فکرمندی سے میرزا کی طرف دیکھا۔ میرزا کے سوال نے ابراہیم کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

بولا کیا فرق پڑتا ہے بیٹا۔ تمھیں اس سے کیا مطلب مان لو میں آقا شریعت مداری کی تقلید کرتا ہوں۔ پیکر اب سنبھل کر بیٹھ گیا وہ سمجھتا تھا کہ میرزا کیوں ایسا سوال

پوچھ رہے ہیں۔ میرزا آنکھ کے گوشہ سے پیکر کو دیکھ رہے تھے۔ جب انہوں نے پیکر کو پریشانی کے عالم میں پایاتو بلند آواز میں بولے

لیکن تم کو"آقا" کی تقلید کرنا چاہئے۔

آقا کون ؟مشہدی کے منھ سے نکلا۔

آقائے خمینی۔

مشہدی کا ہاتھ کانپنے لگا۔ سینی میں رکھی چائے کی پیالیاں بج اٹھیں۔ پیکر شدید غصہ میں اٹھا اسکی آنکھیں حلقہ سے باہر نکلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ مشہدی خوف کی شدت سے لرزتا ہوا دفتر سے نکل بھاگا۔ پیکر میز پر گھونسا مارتے ہوئے چیخا۔

اے کمبخت تو مجھے برباد کر دینا چاہتا ہے۔ خدا تجھے غارت کرے۔ پیکر محمد کو باہر کی طرف دھکا دیتے ہوئے چلایا! جاؤ شٹر نیچے گراؤ ابھی ساواک سب کچھ تہس نہس کر دیگی۔ پیکر نے محمد کو باہر ڈھکیل دیا غصہ کی شدت سے وہ اول فول بکے جا رہا تھا۔اور میرزا بڑے مطمئن نظر آرہے تھے گویا وہ اسی گھڑی کے منتظر تھے۔ پیکر نے انکا بازو پکڑ کر دیوار کی طرف دھکا دیا اور چلایا! آج تک جو بھی کہتے رہے برداشت کرتا رہا۔ تمہاری وقت کی پابندی کی وجہ سے۔ تم نے دوسرے کاریگروں کو بھی زبان دراز بنادیا میں صبر کرتا رہا لیکن

اب حد ہو گئی ہے بس اب تمہاری شکل دیکھنا نہیں چاہتا جاؤ فوراً نکل جاؤ یہاں سے۔ اس نے میرزا کو دروازے کی طرف دھکا دیا۔ میرزا باہر نکل آئے سامنے ہی محمد سے ملاقات ہو گئی۔ کمال اطمینان سے بولے۔ میں جارہا ہوں۔ جب بھی کوئی ڈھنگ کا کام مل گیا تو آپ کے پاس آؤں گا مجھے یقین ہے آپ بھی یہاں نہیں رکیں گے۔ محمد اپنے چھوٹے بھائی سے بہت محبت کرتے تھے۔ وہ پیکر کے لئے کام کرتے تھے لیکن اسے قطعی پسند نہیں کرتے تھے۔ ایک کاریگر ان کے نزدیک سے گزر رہا تھا اس نے ان کو معنی خیز انداز میں دیکھا میرزا نے جسکا جواب صرف ایک مسکراہٹ سے دیا۔ پیکر اب خاموش ہو چکا تھا میرزا کی خدا حافظی کے وقت پورے کارخانہ پر قبرستان کا سا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ حتیٰ احمد جو اس واقعہ سے پوری طرح خوش تھا۔ ساکت و سامت بیٹھا رہا۔ شاید پیکر کا دل سب زیادہ تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ میرزا ہمیشہ کے لئے کام چھوڑ کر جانے کا من بنا چکے ہیں۔ اسکے لئے سخت تھا اسے ہمیشہ کے لئے جاتا دیکھنا جیسے وہ بہت پسند کرتا تھا۔ پیکر ہمیشہ ان کی ذہانت سے خوف کھاتا اور اب وہ دیکھ رہا تھا کہ جس صلاحیت کو وہ اپنے بروکار لانے کی فکر میں تھا وہ عین اس کے مقابل کھڑی تھی۔

میرزا اس وقت بھی قابل محبت تھے۔ ان کے لمبے بال جو سرے پر موی آتش دیدہ کی مانند خمدار تھے اور انکے پیشانی پر سے بائیں طرف نکلی ہوئی مانگ انکی خوبصورتی میں

چار چاند لگاتی تھی۔ میرزا تو مسکراتے ہوئے کارخانہ سے نکل گئے لیکن پیکر کے لئے وہ ایک ادھوری کہانی بنے رہے۔

توحیدی صف

ضمیر کی "بیداری" ایک زندہ دل انسان کے لئے بڑے مصائب کا پیغام لاتی ہے گویا ایک مرد مسلمان اسی دنیا میں خدا کے سامنے اپنا حساب کتاب پیش کر رہا ہو۔

بد قسمتی سے یہ عمل مصطفےٰ کی انفرادی زندگی میں انکے پیچھے رہ جانے کا سبب بن گیا۔ فوج سے نکل بھاگنے اور انکے والد کے انکے ساتھ برے رویہ کی بنیاد پر چار سال تک فقر وناداری کی زندگی گذارنی پڑی ان میں اتنا حوصلہ نہ تھا کہ اپنی زوجہ کو بھی اپنی فرسودہ حالی سے آگاہ کر سکیں۔

وہ کسی ایک جگہ رک کے کچھ کر ہی نہیں سکتے تھے جہاں جاتے انکی جاسوسی ہو جاتی اور انہیں وہاں سے فرار کرنا پڑ جاتا تھا۔ اس زمانے میں صرف "ایرج" سے ملاقات تھی اور "ایرج" انہیں صرف کتابیں دے سکتے تھے۔ مصطفےٰ تاریخ اسلام کی عظیم شخصیتوں کی سوانح عمری بڑے شوق سے پڑھتے تھے جس سے انہیں بڑا حوصلہ ملتا اور اپنے موجودہ حالات پر صبر کرنے کی مزید ہمت ملتی اگر وہ ابھی تک فوج میں ہوتے اور مخالفتوں

سے باز رہتے تو آج یقیناً کسی بڑے عہدہ تک پہنچ چکے ہوتے۔ لیکن ان جیسا شخص جلدی جلدی ترقی کر کے کرتا ہی کیا؟ کیوں کہ وہ اس سے پہلے بھی تو مختلف فوجی ٹریننگ سے گذر چکے تھے؟ انہوں نے تو اس دن بھی احتیاط نہیں کیا جب شاہ کی موجودگی میں فوج کی اسپیشل ریجیمنٹ کی پریڈ ہو رہی تھی۔ اور تیمار رپورٹ پیش کر رہا تھا۔ تو مصطفےٰ اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنا اعتراض جتانے سے باز نہ رہے۔ جس کے سبب مدتوں انہیں جیل میں رہنا پڑا

مصطفےٰ گشت پر تھے اپنی وین کی ڈرائیورنگ سیٹ پر بیٹھے تیزی سے "شہیاد چوک" کی جانب بڑھے جا رہے تھے۔ "آیز نھاور روڈ" کب کی گذر چکی تھی "شہیاد چوک" پر گاڑی موڑتے وقت تعقب نما آئینہ میں اپنے بقیہ ساتھیوں کی گاڑیوں کا بغور جائزہ لیا۔ حالات معمول پر تھے۔ مصطفےٰ نے وین کو کرج جانے والی سڑک پر موڑ دیا۔ اور ایک بار پھر انکا ذہن ماضی کی گہرائیوں میں غوطہ لگانے لگا۔ سن ۱۳۵۳ کے آخری ایام تھے۔ عید نوروز کے لئے ان کے پاس صرف چار تومان تھے۔ حکومت نے ان کے لئے جاسوسوں کا ایسا جال بچھا رکھا تھا کہ عام آدمیوں کی طرح کام نہ کر سکتے تھے کہ اسی راستے سے گھر کا خرچ چلتا عید نوروز سر پر تھی، انکی آنکھوں میں بیٹی کی معصوم نگاہیں ابھر آئیں "شیرین" بخار میں تپ رہی تھی مصطفےٰ اسے کئی بار قریبی نرسنگ ہوم میں دکھا چکے تھے لیکن اب تک کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔ ضرورت تھی کہ کسی اچھے اسپتال میں معائنہ کرواتے۔ انکی بچی انکی نگاہوں کے سامنے بیماری اور موت سے جھوجھ

رہی تھی اور وہ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ زوجہ سے اپنی اضطرابی کیفیت چھپانے کے لئے وہ اٹھے اور گھر سے باہر نکل گئے۔ وہ بغیر کسی مقصد کے گلیوں میں ٹہلنے لگے کہاں جاؤں؟ کیا کروں؟ کس سے قرض لیا جا سکتا ہے؟ ایسے مختلف سوالات انکے انکے ذہن میں گردش کر رہے تھے چار سال پہلے گھر سے نکلتے وقت والد کے کہے الفاظ ابھی بھی انکے کانوں میں گونج رہے تھے۔

تم آوارہ ہو! تم نے اپنے استاد کی طرح سے میری بھی زندگی تلخ کر دی ہے! نکل جاؤ میرے گھر میں تمہارے لئے کوئی جگہ نہیں ہے! میں اب تمہاری شکل نہیں دیکھنا چاہتا

مصطفیٰ خاموش تھے در حالانکہ شوش کے اس فرح آباد نامی محلے کے اکثر جوان انکے سامنے گھٹنے ٹیکتے تھے۔ ایسے حالات پیش آنا شاید خدا کی طرف سے تھا۔ انکا امتحان لیا جا رہا تھا۔ وہ یہی سوچتے تھے جس سے ان کو حوصلہ ملتا تھا گلیوں میں کافی دیر ادھر ادھر پھرنے کے بعد وہ تھک کر گھر کی طرف واپس لوٹے آئے۔ دروازہ پر پہونچے تو گھر میں قیامت بپا تھی گریہ کی دلخراش آوازیں انکے کانوں سے ٹکرائیں۔ مصطفیٰ سمجھ گئے تیزی سے گھر میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ شیرین پر اس کی ماں نے ایک سفید کپڑا ڈال دیا ہے اور خود جنازے کے قریب بجھاڑیں کھا رہی تھی مصطفیٰ بھی بیٹی کی لاش کے پاس بیٹھ گئے۔ اور

ایک باپ بیٹی کی جدائی میں آنکھوں سے امنڈتے ہوئے سیلاب کو روکنے کی ناکام کوشش کرنے لگے۔

مصطفےٰپر وہ وقت آن پڑا تھا بیٹی کے کفن دفن کے لئے بھی انکے پاس پیسہ نہ تھا۔ ایک بار پھر گھر سے نکل پڑے۔ باہر کی دنیا ویسے ہی رواں دواں تھی۔ بازار کی رونق پر کوئی فرق نہیں آیا تھا مگر مصطفیٰ کی دنیا بے نور اور پھیکی پڑ گئی تھی۔ مصطفےٰ نے اپنا اوور کوٹ اڑتالیس تومان میں بیچ کر کفن دفن کے ضروری اسباب خریدے، گھر لوٹتے وقت چھاؤنی کے پاس سے گزرتے وقت سوچنے لگے۔ آج کل چھاؤنی میں کیا چل رہا ہے۔ کاش اپنے دوستوں سے ملاقات کر سکتے۔ چھاؤنی میں انکے کئی بہترین دوست موجود تھے۔ انہیں آج بھی بخوبی یاد تھا کہ آخری بار جب سی.آئی.ڈی آفیسر نے انہیں گرفتار کرنا چاہا تھا تو سڑک کی جانب موجود چھاؤنی کی اسی دیوار کو پھلانگ کر فرار ہوئے تھے۔ ۱۳۴۸ ہوش کی بات تھی سب ایران عراق کی مشتنج سرحد سے لوٹ رہے تھے۔ مصطفےٰ فوج کی اس ٹکڑی کے کمانڈر تھے جو کرمان شاہ سے فوجی سازوسامان کے ساتھ لوٹ رہی تھی۔ جیسے ہی تہران میں داخل ہوئے ایک بڑے مجمع نے انکا راستہ روک لیا۔ لوگ اس دن بسوں کے کرایہ میں بے بہا اضافے کے خلاف مظاہرہ کر رہے تھے مصطفےٰ نے جب دیکھا کہ فوجی دستہ اسلحہ کا استعمال کرنے پر آمادہ ہے تو حکم دیا کہ عام لوگوں پر ہر گز گولی نہیں چلائی جائیگی۔ "سرجنٹ میجر' نے واقعہ کی رپورٹ محکمہ

سراغ رسانی کو پیش کی جس میں مصطفیٰ کے مذکورہ حکم کو حکومت کے خلاف اقدام کا عنوان دیا گیا تھا "سر گردی" نامی سی. آئی. ڈی آفیسر مصطفیٰ کو گرفتار کرنے آیا، مصطفیٰ سمجھ گئے تھے کہ اگر اس بار گرفتار کئے گئے تو انکا زندہ بچنا مشکل ہے لہٰذا چھاؤنی سے فرار کر گئے۔ ایک سال تک "ساواک" (شاہ کی خفیہ پولیس) کے افراد انہیں ڈھونڈتے رہے لیکن انہیں تلاش نہیں کر سکے۔ گھر سے نکالے جانے کے بعد وہ لگاتار اپنے رہنے کی جگہ بدلتے رہتے تھے۔ اور کبھی کبھی تو اس کام کے لئے انہیں میک اپ کے ذریعے اپنا چہرا اور حلیہ بھی بدلنا پڑتا تھا۔

شام ہو چکی تھی اور وہ اپنے دل کے ٹکڑے کو سپرد خاک کر کے گھر لوٹ آئے تھے بیٹی کے غم سے نڈھال ماں باپ ایک دوسرے کو دلاسہ سے رہے تھے۔ تبھی انکی ماں نے گھر پر دروازہ کھٹکٹایا وہ اپنے ہمراہ ایک خوش خبری لائیں تھیں۔ مصطفیٰ کے والد کو انکے دوستوں کے ذریعہ معلوم ہو گیا تھا کہ مصطفیٰ آوارہ نہیں ہیں بلکہ ایک متدین اور وظیفہ شناس جوان ہیں۔ لیکن ماں نے اپنے بیٹے اور بہو کو بیٹی کے غم میں سیاہ پوش پایا۔ پوتی کی موت کی خبر نے انکے اندر بھی قیامت برپا کر دی بوڑھی آنکھوں کا نور کچھ اور پھیکا پڑ گیا۔

مصطفیٰ اپنے ماں باپ کی گریہ کناں آنکھوں کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔ پچھلے چار برسوں میں انہوں نے سب کچھ کھو دیا تھا۔ اور آج بیٹی کی نعمت سے بھی انکا دامن خالی ہو گیا تھا۔ اب

انکے والد بھی کیا کر سکتے تھے ؟۔ مصطفیٰ کو خدا سے کیا گیا اپنا وعدہ یاد آگیا آگے بڑھ کے باپ کے سینے سے لگ گئے۔ اس دن کے بعد فقر و ناداری نے مصطفیٰ کا دامن چھوڑ دیا۔ انکے والد نے انکے لئے "مینی بس" خریدی جس کے ذریعہ کسب و معاش کریں اور اس وقت مصطفیٰ اسی منی بس پر سوار مختلف سڑکوں پر گشت لگا رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ حافظے کے سہارے اپنے ماضی کا مشاہدہ کر رہے تھے۔ تاکہ ماضی پر نگاہ رکھتے ہوئے اپنے مستقبل کو سنواریں۔

وہ خبیث کمانڈر "خسرو داد" انھیں بخوبی یاد آرہا تھا جو اپنے چھوٹے سے قد میں بہت بڑا شر چھپائے تھا وہ سب کو اپنی سازشوں کا شکار بنا لیتا تھا۔ یقیناً آج وہ کسی بڑے عہدے تک جا پہنچا ہوگا انھیں ایرج شدت کے ساتھ یاد آرہا تھا۔ مدرسہ کے ایام میں ایرج سے شناسائی ہوئی تھی جو بعد میں دوستی میں بدل گئی تھی لیکن فوج میں بھرتی ہونے کے بعد وہ غائب ہو گیا تھا۔ ایرج سنجیدہ اور خاموش طبیعت کا مالک تھا پٹرول پمپ پر پہنچنے پر مصطفیٰ کی یادوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ انھوں نے کلائی پر بندھی گھڑی پر ایک نظر ڈالی ابھی ایک گھنٹہ بچا تھا انہیں ایک ایسے شخص سے ملاقات کرنا تھی جس سے یہ ملاقات ایرج کے توسط طے پاتی تھی اور خود مد نظر شخص سے خود ایرج کی آشنائی حاج مہدی عراقی کے ذریعہ ہوئی تھی۔ مصطفیٰ نے ایک کیلو میٹر مزید آگے جا کر گاڑی موڑی۔ مصطفیٰ بڑی احتیاط سے کام لے رہے تھے۔ تعقب کے خطرہ کو زیر نگاہ رکھتے ہوئے وہ چاروں طرف سے ہوشیار

تھے۔انھوں نے گاڑی اسی جگہ روک رکھی تھی جہاں سے انکے لئے خطرہ کی صورت میں نہ صرف کرج جانے والی سڑک کے دونوں جانب بلکہ کچے راستوں سے نکل بھاگنے کا امکان بھی موجود تھا۔

وہ منی بس سے نیچے اتر آئے تھے۔پٹرول پمپ کی جانب سے آنے والا جوان انھیں دور سے ہی نظر آگیا تھا۔ چھوٹے چھوٹے بالوں والے فوجی وردی میں ملبوس اس جوان نے عینک لگارکھی تھی۔ مصطفٰے اسوچا حتمآ یہی ہے۔دونوں بس پر سوار ہو گئے۔ مصطفٰے ا نے غور سے آنے والے کا جائزہ لیا۔ بتائی گئی ساری نشانیاں موجود تھیں۔ مصطفٰے انے اپنے مضبوط آہنی ہاتھ کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا!

ٹھیک جگہ پہونچے ہو جوان۔

شکریہ (مصافحہ کرتے ہوئے) مجھے لوگ میرزا کہہ کر پکارتے ہیں۔

آنے والے کی آنکھوں اور لہجہ میں موجود اطمینان نے مصطفٰے اکو متحیر کر دیا تھا۔ مصطفٰے انے بھی میرزا کی طرح ہی عارضی نام کے ذریعہ تعارف کرایا وہ آنے والے کے ساتھ اسی کے جیسا برتاؤ کرنا چاہتے تھے۔

پھر مصطفےٰ بس حرکت میں لاتے ہوئے بولے ! انشائ اللہ راستے میں بہتر گفتگو ہو سکے گی۔

میرزا بولے مجھے بتایا گیا ہے کہ تم فوجی ٹرینگ اور دھماکہ خیز ہتھیار بنانے میں ہماری مدد کر سکتے ہو۔

میرے بنائے ہوئے بم امام حسینؑ کے نام پر جان دینے والوں کے کام آتے ہیں۔

مصطفےٰ کو میرزا کے لبوں پر ظاہر ہونے والی مسکراہٹ سے اپنا جواب مل گیا۔

ہم بھی ایسے ہتھیار کو قبول کرتے ہیں جو کربلائی مزاج رکھنے والوں کی جانب سے دشمن پر چلائے جائیں۔

بارش کی ہلکی پھوہاروں میں وہ وین کو سست رفتاری سے چلا رہے تھے۔

آپ لوگوں کو آگ لگا دینے والے بارودی ہتھیار کے استعمال میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی لیکن دھماکہ کرنے والے طاقتور بموں کے استعمال کے لئے مہارت کی ضرورت ہے۔ یہ کام خطرناک ہوتا ہے۔ بہتر ہو گا کہ آپ لوگ شروع میں دستی بموں سے شروعات کریں۔اسکے لئے شہر سے باہر ایک جگہ دھونڈھنی پڑے گی۔

ہمارے لئے فوجی ٹرینگ ایک بڑا مسئلہ ہے۔

مصطفیٰ کچھ دیر تک خاموش رہے۔ وہ بغیر سوچے سمجھے میرزا سے کوئی وعدہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ اس جوان پر کتنا بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔اب تک وہ اس جوان جیسے سیکڑوں فوجیوں کو ٹرینگ دے چکے تھے۔ کچھ دیر بعد مصطفیٰ بولے !

میں آپ لوگوں کا یہ مسئلہ حل کردونگا۔

مصطفیٰ کے اس جملے نے میرزا کو مطمئن کردیا تھا۔ وہ سیٹ کی پشت گاہ سے ٹک کر اطمینان سے بیٹھ گئے۔

آپ لوگ بارود مہیا کریں بقیہ لوازمات کی دستیابی ہماری ذمہ داری۔

مصطفیٰ اپنے والد کے دوست "دارانی" کی بارودی کان سے "بارود" بڑی آسانی سے بھی حاصل کرسکتے تھے۔ لیکن وہ میرزا کے دعوؤں کی گہرائی ناپنا چاہتے تھے۔ میرزا نے تن کر بیٹھے ہوئے کہا۔

ٹھیک ہے ! دو ہفتہ بعد معاملہ طے ہے۔

اس وقت وہ دونوں کرج جانے والے قدیمی راستہ سے گذر رہے تھے۔ چاروں طرف اندھیرے کی حکمرانی تھی صرف سامنے سے آنے والی گاڑیوں کی تیز روشنی جس

میں اکثر ٹرک تھے تھوڑی دیر بعد وین کو روشنی کا غسل کرادیتیں۔ اچانک مصطفٰی نے وین کو سڑک کے ایک کنارے پر روک دیا۔ اور خود ڈرائیور کی سیٹ سے اتر پڑے وہ گھوم کر میرزا کی طرف والی کھڑکی سے سامنے آکر کھڑے ہوگئے۔ میرزا انھیں سوالیہ انداز سے دیکھ رہے تھے۔ مصطفٰی نے اپنی کمر میں لگا ہوا دیسی پستول جو "ریوالور" کی ساخت جیسا تھا نکالتے ہوئے میرزا کو دیا اور نہایت خلوص اور احترام کے ساتھ بولے!

یہ پہلا تحفہ میری طرف سے آپ کے لئے۔

میرزا نے "پستول" ہاتھوں میں لیتے ہی مصطفٰی کو گلے سے لگا لیا۔ مصطفٰی نے اس معانقہ میں صداقت اور خلوص کی گرمی محسوس کی۔

مصطفٰی نے میرزا کے بازؤں کو دوستانہ انداز میں جھنجھوڑا اور پستول کو واپس انکی طرف بڑھاتے ہوئے کہا!

ہم لوگوں کی مدد کرنے کے لئے بہت سے لوگ حاضر ہیں لیکن مزہ تو تب ہے جب ہم اپنا اسلحہ خود تیار کریں۔

مصطفٰی دل ہی دل میں میرزا کے جذبوں کو داد دے رہے تھے۔ انہوں نے اپنا پستول واپس لے لیا اب وہ سوچ رہے تھے کہ انکا یہ عمل میرزا کی ناراضگی کا سبب بنا ہے۔

لیکن فوراً ہی انہیں اس گمان کی تردید کرنی پڑی کیونکہ میرزا تو رسول خدا(ص) کی ان سختیوں کا ذکر کر رہے تھے جو آنحضر (ص) نے شعب ابی طالب میں رہ کر سہی تھیں۔ خاص طور پر جب انہوں نے میرزا کو یہ کہتے ہوا سنا کہ !

"اب اس کے بعد تو ہمارے درمیان اسلحوں کا تبادلہ ہوتا ہی رہے گا۔"

توانہیں اطمینان ہو گیا کہ میرزا کبیدہ خاطر نہیں ہوئے ہیں۔ پھر انکے درمیان کوئی خاص گفتگو انجام نہیں پائی تھی۔ پھر میرزا نے خدا حافظی کی اور دودھ پیک کرنے والے کارخانے کے نزدیک مصطفےٰ سے گاڑی روکنے کو کہا۔ وین سے اُتر کر وہ اندھیرے میں سماتے چلے گئے۔

میرزا نے اگلے روز "مجاہد بن خلق" کے رابط کو ملاقات کا پیغام بھجوایا۔ انکے دل پر پچھلے دن مصطفےٰ کے ساتھ ہوئی ملاقات کا عجیب تاثر تھا۔

وہ مسلسل سوچ رہے تھے کہ کیا واقعاً وہ شخص بغیر کسی قیمت کے اپنا برسوں کا تجربہ ہمارے حوالے کردے گا۔ کہیں کوئی سازش نہ ہو۔ لیکن مجھے اس کی حرکات وسکنات اور باتوں میں کوئی مشتبہ عنصر نظر نہیں آیا۔ ہاں یہ مسئلہ عجیب ہے کہ وہ صرف ایک وین کا ڈرائیور ہے گاڑی چلانے کے علاوہ نہ جانے وہ اور کیا کرتا ہو۔ نہ جانے کیسے لوگوں کے ساتھ اس کا اٹھنا بیٹھنا ہو۔ ایسے افراد کے ساتھ کسی بھی قسم کا تعلق رکھنا جہاں

خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ وہیں ایسے لوگ کبھی کبھی بڑے کام کے نکلتے ہیں۔ مجھے اس پر بھروسہ کرنا چاہئے یا نہیں! ؟ کیا ایسے لوگوں پر اعتماد کیا جا سکتا ہے ؟ اگر وہ باتوں میں سچا نکلا جیسا کہ میرا دل کہتا ہے تو وہ یقیناً مثبت جواب کا حقدار ہے۔ وہ ہمارے جوانوں کو مختلف قسم کی فوجی تربیت کے ذریعہ ماہر لڑاکوں میں تبدیل کر سکتا ہے۔ وہ ہماری فوج کا آئیڈل بن سکتا ہے۔ فوج سے فرار اور گھر سے نکالے جانے نے اسکی طبیعت پر عجیب اثر چھوڑا ہے۔ مصطفیٰ کے سلسلے سے ایسے ہی متعدد سوالات میرزا کے ذہن میں گردش کر رہے تھے۔ یہی سوچتے ہوئے اس شخص کے گھر تک جا پہونچے جسکے توسط سے وہ "مجاہدین خلق" سے رابطہ برقرار کرتے تھے۔ وہ بارہا اس شخص سے ملاقات کر چکے تھے۔ "مجاہدین خلق" نے تقریباً اپنی تمام باتوں واضح طور پر کہہ دی تھیں۔ میرزا نے انکی بیان کردہ پچھلی شرائط قبول نہیں کی تھیں اور آج اس امید میں پھر ادھر آ نکلے تھے کہ شاید وہ لوگ اسلحہ دینے کے لئے آج کچھ نئی شرطیں انکے سامنے رکھیں۔

"ہم لوگ صرف انہیں اسلحہ دیتے ہیں جو ہمارے منصوبوں کے مطابق عمل کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ ہماری تنظیم خود اپنا مخصوص نصب العین اور خاص حکمت عملی رکھتی ہے اور اسی کی بنیاد پر لائحہ عمل تیار کیا جاتا ہے۔ آپ ہمارے ایک کسی منصوبہ کو پورا کرنے کی ذمہ داری لے سکتے ہیں۔ ایسے میں ہم آپ کا مکمل تعاون کرنے کو تیار ہیں۔ اور یاد رہے کہ ہر معاملہ میں ہماری تنظیم کے سربراہ کا فیصلہ ہی آخری فیصلہ ہوگا "

لیکن وہ سب تو پھانسی پر چڑھادیئے گئے۔

ہماری تنظیم زندہ اور فعال تنظیم ہے۔

مارکسٹوں کی یہ متعدد شاخیں کہاں سے وجود میں آرہی ہیں؟

"مجاہدین خلق" کے نمائندے کو اس قسم کے سوال کی امید نہ تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میرزا اس بحث کو بیچ میں لے آئیں گے۔ وہ متحیر رہ گیا تھا۔ اگرچہ خود اس کے لئے ابھی تک یہ مسئلہ ایک معمہ تھا۔

وہ خود سوچنے لگا۔ واقعاً کیا بات ہے ابھی چند روز پہلے ہی تقی شہرام کی قیادت میں کچھ لوگوں نے مارکسٹی نظریہ کو اپناتے ہوئے تنظیم سے جدا ہو کر ایک الگ انجمن بنالی تھی۔

تقی شہرام نے کچھ ایسی باتوں کا اعتراف کیا بھی کیا تھا جو 'ساواک' کے لئے بہت قیمتی تھیں۔ اور رہی سہی باتیں وحید افراختہ نے اپنے اعتراف میں برملا کردی تھیں جس نے ساواک کو تمام اعضاء نے نام، انکے پتے اور خفیہ جلسوں کی جگہیں، اسلحے مخفی رکھنے کے زمیں دوز ٹھکانے اور تنظیم کی آئندہ پالیسیوں تک سے آگاہ کردیا تھا لیکن "ساواک" ان

اطلاعات پر اس طریقہ سے کاروائی کر رہے تھے کہ مذکورہ خائن لوگوں کا راز عام نہ ہو پائے۔

میرزا نے تنظیم کی اندرونی چپلقش کے متعلق تھوڑا بہت سن رکھا تھا میز کی دوسری جانب بیٹھے شخص نے اپنے چہرہ کو نقاب سے ڈھانک رکھا تھا۔ میرزا کو بھی اس بات سے دلچسپی نہیں تھی کہ وہ کون ہے؟ مجاہدین خلق کا ترجمان فکر میں ڈوبا ہوتا تھا۔ اسے میرزا سے کہیں زیادہ تنظیم کے مستقبل کی فکر تھی

ایسی باتوں کے سامنے آجانے پر وہ نروس سا ہو گیا تھا۔ لیکن اُسنے جی کڑا کرتے ہوئے کہا!

سارے انسان ایک جیسے نہیں ہوتے۔ سب کو ایک نگاہ سے نہیں دیکھنا چاہئے۔ جنگ کے سخت مرحلہ میں داخل ہوتے ہی ناخالص افراد چھٹ جایا کرتے ہیں۔ مذکورہ لوگوں کو ہر حال میں تنظیم چھوڑنا ہی تھی اور وہ الگ ہو گئے۔ شاید آئندہ بھی ایسا ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ مزید الگ ہو جائیں۔ بہر حال ہم "مجید شریف واقفی" کی شہادت سے بہت رنجیدہ ہیں اور شہادت بھی کیسی دردناک کہ دشمن نے مرحوم کے جسم کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ ہمارا ایک بہترین کارکن قتل کر دیا گیا۔ میرزا نصیحت آمیز لہجہ میں بولے!

تم لوگوں کو ہشیار رہنا چاہئے۔اس طرح کے اقدام "ساواک" کی مدد ہے، مجید کا قتل ایک سلسلہ ہے اگر اپنی غلطیوں پر توجہ نہ کی تو یہ چلتا رہے گا

پھر میرزا نے فوراً ہی موضوع بدلتے ہوئے پوچھا!

تم لوگ "آقا" کے ساتھ کیوں نہیں مل جاتے ؟

تحریک انقلاب کی کشتی کے پتوار ہمارے ہاتھوں میں ہیں۔

انقلاب کا مرکز "15 خرداد" ہے۔ "آقا" کی کتاب "جہاد اکبر" اور "ولایت فقیہ" انقلاب کا ایک بہترین نصاب ہے۔

تنظیم کے ترجمان نے ایک کتاب میرزا کی طرف بڑھائی جسے اس نے پہلے ہی سے مہیا کر رکھا تھا۔کتاب کا نام "شناخت" تھا۔اس کتاب میں "مجاہدین خلق" کے بنیادی عقائد پیش کئے گئے تھے۔

ہم اپنا ایک نظریہ رکھتے ہیں، قرآن کو بہتر سمجھنے کے لئے تنظیم میں مولوی بھی موجود ہیں لہٰذا ہم کو ان کے علاوہ کسی کی ضرورت نہیں۔

مجاہدین خلق کا نمائندہ ایسی بات کہے گا میرزا کو ہرگز اس کی توقع نہ تھی وہ اس سے پہلے پیش نظر کتاب پڑھ چکے تھے۔ وہ بے توجہی سے یوں ہی کتاب کو ورق گردانی کرنے لگے۔ اس پر وہ شخص مسکرایا اور بولا!

اسلحہ کا حصول اس کتاب کے مندرجات پر عمل کرنے سے مشروط ہے۔

میرزا کی قوت صبر جواب دے گئی کتاب کو زمین پر دے مارا اور شدید غصہ میں بولے!

سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم سب اس قدر خود سر ہو گئے ہو وہ تنظیم جس کی بنیادوں میں "حنیف نژاد" اور "رضایی" جیسوں کا خون صرف ہوا تھا آج ایک بے لگام سرکش گھوڑے کی مانند ہو جائے گی کہ اگر لگام نہ کھینچی جائے تو جسے چاہے روند ڈالے

ترجمان کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ میرزا بولتے رہے!!!

ایک زمانے سے ہم لوگ "آقا" کے فرمودات کے اشتہارات اور کیسٹس منتشر کر رہے ہیں۔ تم لوگوں کی شرطیں قبول کرنا یعنی ان سب کاموں پر پانی پھیر دینا ہے۔

" آقا" اور انکے ساتھ موجود علماء کی حمایت کا جو تم لوگوں نے ڈھونگ رچا رکھا ہے وہ صرف خود کو محفوظ رکھنے کے لئے ہے۔

پھر میرزا وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے وہ نہایت غم وغصہ سے بھرے ہوئے تھے۔ آخر کیوں ایک تنظیم بیچ جنگ میں منحرف ہوگئی؟ کہیں ہم لوگ بھی ایسے حالات سے دوچار نہ ہوجائیں؟ آخر یہ لوگ "آقا" سے کیوں اتفاق نہیں رکھتے؟ مجاہدین خلق کا ترجمانا نہیں جاتا دیکھتا رہا وہ کچھ مزید کہنا چاہ رہا تھا لیکن خاموش ہی رہا۔ اب میرزا نے یہاں سے اسلحے حاصل کرنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ وہ تیزی سے وہاں سے چلے گئے۔

"استاد ابراھیم" گلی کے موڑ پر انکے منتظر تھے۔ میرزا موٹر سائیکل کی پچھلی گدی پر بیٹھ گئے۔ ابراہیم نے فوراً ہی موٹر سائیکل اسٹارت کی میرزا نے ابراہیم کے کان میں کہا!

موٹر سائیکل گھماؤ اور مولوی روڈ پر نکل چلو! گلی گلی چلنا! فی الحال ہم اپنی اصلی منزل کی طرف نہیں جائیں گے۔

امیر استاد ابراہیم نے سر کو اثباتی جنبش دی اور میرزا کی ہدایت کے مطابق مختلف گلی کوچوں میں یوں ہی پھرتے رہے۔ وہ لوگ پوری طرح اطمینان کرلینا چاہتے تھے کہ تنظیم کی عمارت سے نکل کر کوئی انکا تعقب تو نہیں کر رہا ہے۔ وہ لوگ اپنے مخفی ٹھکانے کو کسی پر ظاہر نہیں کر سکتے تھے میرزا سوچ رہے تھے کہ یہ ملاقات، یقینا "مجاہدین خلق"

سے انکے رابطوں کو ختم کر دیتے والی ثابت ہو گی۔ لیکن میں کرتا بھی تو کیا؟ آخر یہ لوگ خود اپنے کارکنوں کو کیوں قتل کر رہے ہیں؟ یہ آپسی رنجش کا کیا سبب ہے؟

یہ لوگ "آقا" کو انقلاب کے حاشیہ پر رکھتے اور سمجھتے ہیں۔ اس تنظیم کا انجام نہ جانے کیا ہو گا؟ اس شخص کی باتوں سے گودرزی یاد آتا ہے۔ "فرقان" نامی گروہ کا سربراہ گودرزی بھی ایسی ہی باتیں کرتا ہے۔ اگرچہ اسکی باتیں اشارہ و کنایہ میں ہوا کرتی ہیں۔ گودرزی ایک پڑھا لکھا عالم دین شمار کیا جاتا ہے لیکن اسے اپنے علم سے کام لینا نہیں آتا۔ اس قسم کے سارے لوگوں سے ہمیں دور ہی رہنا چاہیئے "فرقان" نامی گروہ نے "المدام چوک" پر متعدد جلسات منعقد کئے ہیں جو جوان اس تنظیم سے جڑ رہے ہیں ان میں اکثر کی نیت صاف ہے

میرزا "مجاہدین خلق" کے ترجمان کی باتیں سن کر بڑے مضطرب تھے انہیں خود اپنی ذات سے ڈر لگ رہا تھا۔ وہ بھی تو تیس لوگوں کی سربراہی کر رہے ہیں

"حمید" سے میرزا کی ملاقات چھاؤنی میں ہوئی۔ ظہر کے وقت صرف تین شخص ہی چھاؤنی کی مسجد میں نظر آئے تھے۔ میرزا، حمید کے علاوہ صرف ایک اور فوجی ہی وہاں ہوتا۔ "لفٹننٹ دوزد" جب سے ادارہ تنصیبات کا انچارج بنا تھا چھاؤنی مین بڑی افرا

تفری اور آشفتگی پھیلی ہوئی تھی۔ سبھی اس سے بچتے پھرتے اور آزاد وقت میں زیادہ تر اپنے کمروں میں دبکے رہتے

لیکن جب "لفٹننٹ دوزد" کا تبادلہ ہو گیا اور ایک دوسرا فوجی اس کی جگہ آگیا تو میرزا کو تھوڑی آزادی ملی اور جب معلوم ہوا کہ وہ امام خمینی کا معتمد ہے تو میرزا اور اسکے بیچ تعلقات بڑھتے ہی چلے گئے۔ اور پھر میرزا اور حمید کو چھاؤنی سے نکلنے میں کبھی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ حمید اپنے خسر کے یہاں جو ان کے خالو بھی تھے قالب گری سیکھنے جاتے تھے۔ میرزا نے انہیں صرف یہی کام سپرد کیا تھا۔ وہ سانچے بنانے کا کام "شہر رے" کے چیت کارخانہ میں سیکھتے۔ حمید کے علاوہ میرزا نے بم میں استعمال ہونے والے چھرّوں کی تراش کا کام سیکھنے کے لئے بیک زادہ کو منتخب کیا تھا۔ بیک زادہ جوانُ العمر اور بہت ذہین تھے، متوقع وقت سے پہلے ہی انہوں نے چھرّے تراشنے والی مشین پر مہارت حاصل کرلی تھی۔

تیسرا شخص "احد" تھا جو میرزا کے لئے بہت اہمیت رکھتا تھا۔ ماما زن چھاؤنی کے اسلحوں پر قبضہ کرنے کا منصوبہ اسی نے بنایا تھا۔ اسی طرح ہتھ گولے بنانے کے کارخانے کے لئے مناسب جگہ اور زمین بھی اسی نے تلاش کی تھی۔ واربن کے "گرگ تبہ" نامی علاقہ میں موجود یہ جگہ اب استعمال کے قابل بھی بن چکی تھی۔ میرزا نے اس کارخانہ کی

تعمیر کے لئے ضروری ایک لاکھ تومان کی رقم حاج مہدی عراقی کے نمائندہ سے حاصل کی تھی۔

حاج مہدی جیل میں تھے لیکن انکا رابطہ مختلف سیاسی گروہوں سے اب بھی برقرار تھا۔ جیل میں ہی انہیں "مجاہد بن خلق" کے مختلف شاخوں اور کارکنوں کی خیانتوں کا علم ہو گیا تھا۔ لہٰذا انہوں نے یہ رقم میرزا کو دلوائی تھی۔ حاج مہدی تقریباً پچاس برس کے ہو چکے تھے۔ وہ انقلابی تحریک میں ۱۵ خرداد سے پہلے سے ہی شامل تھے۔ امام خمینی سے انکے نزدیکی تعلقات تھے۔ لیکن میرزا کو مذکورہ تعلقات کا کچھ علم نہ تھا۔ ان پر میرزا کا بھرسہ کرنا محض انکی شاہ مخالف کارگردگی اور امام خمینی کی نسبت انکے خلوص کا نتیجہ تھا۔ میرزا کو یقین تھا کہ حاج مہدی اس رقم سے موجودہ ظالم حکومت کے خلاف محض مسلح جنگ کی تقویت چاہتے ہیں کچھ اور نہیں۔ انکے ساتھ میرزا کے تعلقات سے کوئی تیسرا آگاہ نہیں تھا۔ لہٰذا بیک زادہ کے لئے یہ ایک معمہ تھا کہ میرزا نے اتنی بڑی رقم کہاں سے مہیا کی۔ انہیں بخوبی یاد تھا کہ ابھی چند روز پہلے ہی جب میرزا کے یہاں ولادت ہونے والی تھی تو اسپتال کے خرچ کے لئے ان کے پاس تین سَو تومان بھی نہ تھے۔ جس کے لئے انہوں نے بڑی بھاگ دوڑ کی لیکن مہیا نہ کر سکے تھے

سیاسی مقاصد کے لئے میرزا کے پاس وسائل کی کمی نہ تھی لیکن خود انکی شخصی زندگی تہی دستی میں بسر ہو رہی تھی۔ انکا پہلا بچہ مناسب معالجہ کے لئے پیسوں کی کمی کی بنا پر صرف تین دن زندہ رہ سکا تھا۔ میرزا نے اسے دفن کرنے کے بعد صرف ایک جملہ کہا تھا۔ "خدایا تیری رضا پر میں راضی ہوں۔" میرزا اپنے شخصی کاموں کا حساب سیاسی سرگرمی سے بالکل جدا رکھتے تھے۔

سیاسی کاموں کے لئے وسائل کی کمی نہ تھی لیکن گھر کے خرچہ کے لئے میرزا کا ہاتھ خالی تھا۔ یہی بات انکی زوجہ کی ناراضگی کا سبب بنتی۔ میرزا انہیں سمجھانے کی ناکام کوشش کرتے۔ میرزا انکی ناراضگی کو حق بجانب سمجھتے لیکن پیچیدہ سیاسی حالات میں الجھ کر سب کچھ بھول جاتے انکی زوجہ کو اپنے شوہر پر اعتماد تھا وہ بھی شوہر کے ساتھ حالات سے سمجھوتا کر ہی لیتیں

میرزا کارخانہ سے لگے ہوئے باغ میں ٹہل رہے تھے چہرے پر گہرے تفکرات کے اثرات نمایاں تھے۔ آج کارخانہ میں تیار پہلے گرینڈ کی آزمائش ہونی تھی۔ حمید اور بیک زادہ کے علاوہ اور تین شخص تیزی کے ساتھ کاموں میں مشغول تھے۔ میرزا "امیر" نامی شخص سے "بارود" حاصل کرنے امیر کو اس کام میں زیادہ تجربہ نہ تھا امیر نے ہی بیک زادہ کو میرزا سے ملوایا تھا۔ میرزا کے ساتھ کام کرنے والے آدمیوں میں مختلف

فنون کے ماہرین تھے۔ حمید نے تیار شدہ پہلا گرینڈ سانچے سے باہر نکالا۔ پھر وہ سب میرزا کے ساتھ باغ کی طرف روانہ ہوئے۔ حمید نے باغ کے وسط میں پہنچ کر گرینڈ کی پِن نکال کر دور اچھالا لیکن تجربہ نہ ہونے کی وجہ سے گرینڈ نزدیک ہی گرا ایک زوردار دھماکہ کے بعد "حمید" کی چیخ سنائی دی۔ دھماکہ خیز مادہ کی زیادتی کی وجہ سے دھماکے کی آواز بہت شدید تھی۔ آواز کی تیز لہروں نے حمید کے ذہن پر بُرا اثر ڈالا تھا۔ میرزا سرعت کے ساتھ حمید تک پہونچے اور انہیں سنبھالا۔ بیک زادہ نے بڑی سرعت کے ساتھ باغ کے چارو طرف ایک چکر لگایا۔ وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ کوئی اور تو دھماکے کی طرف متوجہ نہیں ہوا؟ میرزا حمید کو کارخانہ کے کمرے میں لے آئے تھے۔ انکی حالت ابھی بھی پوری طرح قابو میں نہیں آئی تھی۔ میرزا مضطربانہ گھڑی کی جانب دیکھ رہے تھے۔ انہیں خوف تھا کہ کہیں پولیس متوجہ نہ ہو گئی ہو۔ وہ ایک بار پھر باغ کی طرف نکل پڑے۔ بغلی ہولسٹر کو تھپتھپا کر دیکھا۔ ریوالور موجود تھا تبھی باغ کی جانب ایک موٹر سائیکل کی آواز نے انہیں چونکا دیا۔ کیا کوئی پولیس کا آدمی آرہا ہے؟ میرزا نے ریوالور ہاتھ میں نکال لیا اور ایک درخت کی اوٹ میں ہو گئے لیکن موٹر سائیکل پر آنے والا احد نکلا میرزا سامنے آ گئے۔

سلام علیکم میرزا ساری تیاریاں پوری ہو چکی ہیں۔

میرزا نے سلام کا جواب دیا اور موٹر سائیکل کی پچھلی گدی پر بیٹھ گئے۔

شہر کی طرف جانے والی اصلی سڑک تک پہنچتے پہنچتے تاریکی چھاگئی۔ چھاؤنی کے چاروں کونے پر تیز روشنی والی سرچ لائٹوں نے گردش کرنا شروع کردیا تھا۔ بلند چہار دیواری کے علاوہ خاردار تار سے گھری یہ چھاؤنی نسبتاً چھوٹی تھی جسکی رہائشی عمارت تین بڑے کمرے اور ایک چھوٹے صحن میں محدود تھی۔ لہٰذا چوکیداروں کی تعداد بھی کم تھی۔

اسی لئے چھاؤنی میں آمدورفت بھی نہ کے برابر تھی۔ احد نے سرعت کے ساتھ موٹر سائیکل سے چھاؤنی کا ایک چکر لگایا تاکہ میرزا حالات کا جائزہ لے سکیں۔

ٹھیک اسی وقت ایک اور موٹر سائیکل ان کے ہمراہ ہوگئی۔ اب انھیں ایک گاڑی کا مزید انتظار تھا۔ جو اسلحہ لے جانے کے لئے پہلے ہی سے منصوبہ کا حصہ تھی۔ احد نے اپنے علاوہ دو مزید موٹر سائیکلوں کو اپنے اطراف چلتے ہوئے پایا۔ میرزا اور انکے بیچ مخصوص اشاروں کا ردّوبدل ہوا۔ احد کو نہیں معلوم تھا کہ دوسری موٹر سائیکل پر سوار حسین شکوری اور سعید اسی طرح کار چلانے والا "زکریان" بھی اس کاروائی میں انکے ساتھ ہوں گے۔ طے یہ تھا کہ سب مل کر بیک وقت حملہ کریں گے۔ اور ہر ایک آدمی ایک ایک چوکیدار کو سنبھالے گا۔ لیکن کسی کو قتل کرنا انکے منصوبے میں شامل نہیں تھا۔ لہٰذا میرزا کی کوشش یہ تھی کہ حملہ اچانک کیا جائے۔ ایک سپاہی ہاتھوں میں مشین گن لئے صحن میں گشت لگا رہا تھا۔ اسکی خواب آلودہ آنکھیں گواہی دے رہی تھیں کہ وہ اپنے اطراف

سے غافل ہے اور صرف اپنی ڈیوٹی ختم ہو جانے کا انتظار کر رہا ہے دونوں موٹر سائیکلیں سرعت کے ساتھ بیک وقت چھاؤنی میں داخل ہو گئیں۔ ایک نے صحن میں ٹہل رہے چوکیدار کو سنبھالا اور میرزا "کمانڈر" کے آفس کی طرف آگے بڑھے........جو ٹیلی ویژن دیکھنے میں مشغول تھا میرزا کے ہاتھ میں اٹھے پستول کو دیکھ کر جسکا نشانہ ٹھیک اسکے بائیں پہلو پر تھا "کمانڈر" دم بخود رہ گیا۔

تم کو ہم سے کوئی نقصان نہیں پہونچے گا اگر تم نے بے چوں وچرا ہمارے احکامات پر عمل کیا! میرزا بڑے سرد لہجے میں بولے!

کمانڈر کی زبان تو جیسے تالو سے چپک کر رہ گئی تھی۔ وہ متحیرانہ منھ کھولے ان مسلح نقاب پوش کو دیکھے جارہا تھا۔ جو ملک الموت کی طرح اچانک اور بغیر کسی روک ٹوک کے آدھمکے تھے میرزا نے سبھی کو نقاب استعمال کرنے کی تاکید کی تھی۔

میرزا نے پستول سے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ اور بولے چلو اسلحہ خانے کا تالا کھولو!

کمانڈر نے ایک بار پھر پستول کی طرف نگاہ کی اور ہاتھ بڑھا کر میز پر رکھی کنجیاں اٹھائیں اور اسلحہ خانے کی جانب چل پڑا۔ شکوری اور احد نے ایک ایک کرکے سارے چوکیداروں کو غیر مسلح کرکے ایک کمرے میں بند کر دیا اور شکوری کو میرزا کے اشارے کا انتظار تھا۔ احد صدر دروازہ کی جانب چلے گئے کہ کہیں کوئی اندر نہ آجائے۔ سعید میرزا

کے ہمراہ تھے "کمانڈر" نے تالے کھولنے سے پہلے ایک بار پھر میرزا کی جانب دیکھا میرزا نے پستول سے جلدی کرنے کا اشارہ کیا میرزا اور سعید کی مستعدی دیکھ کر "کمانڈر" نے کسی قسم کے رد عمل کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ اسلحہ خانہ کا دروازہ انکے لئے کھل گیا تھا۔

میرزا نے ایک بار انبار کی طرف دیکھا بڑی تعداد میں مختلف قسم کے اسلحے سے پورا اسٹور روم بھرا پڑا تھا۔ میرزا نے سعید کو اسلحے لے جانے کو اشارہ کیا مختلف قسم کے اسلحہ جن میں سے بعض کو یہ لوگ پہلی بار نزدیک سے دیکھ رہے تھے "کار" میں رکھ دیئے گئے۔ پھر سب سے پہلے "زکریاں" نے کار اسٹارٹ کی اور انکے پیچھے پیچھے دونوں موٹر سائیکلیں تیزی کے ساتھ چھاؤنی سے نکلتی چلی گئیں۔ بیچ صحن میں کھڑا کمانڈر حیرانی اور خوف کے عالم میں انھیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا ۔

شاہی حکومت کو چیلنج

اب گروہ کو باقاعدہ منظم کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ ضروری تھا کہ ہر فرد کو ایک خاص ذمہ داری دے دی جائے تاکہ کوئی منصوبہ سے ہٹ کر کوئی قدم نہ اٹھائے۔ میرزا سوچ رہے تھے کہ محسن، مصطفےٰ، شقاقی، اکبر وغیرہ کی موجودگی میں اب وہ لوگ باقاعدہ ایک گروہ کے عنوان سے اپنی موجودیت کا اعلان کر سکتے ہیں۔ میرزا نے قرآن مجید سے گروہ کا نام تجویز کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ نئے سال ١٣٥٦ کی سرگرمیاں وہ اسی نام

سے شروع کریں گے۔انکامنصوبہ تھاکہ ابتداء میں سب کو آگاہ نہ کیاجائے بلکہ آئیندہ کی کاروائیاں اسی نام سے انجام دی جائیں۔ خصوصاً آنے والے ۱۵ خرداد کے لئے جو منصوبہ پیش نظر ہے ان کو انجام دینے کے بعد گروہ کا نام لیا جائے۔ ہمیں "ساواک" کو پہلے سے ہشیار نہیں کرنا چاہے۔

صحن خانہ میں ٹہلنے کاانداز بتارہاتھاکہ میرزاکسی کے منتظر ہیں۔انگلیاں ڈاڑھی سے الجھتی تھیں، بار بار کھڑکی پر نظر ڈالتے۔ اچانک دقّ الباب ہوا دروازے پر محسن تھے میرزانے آگے بڑھ کے انہیں گلے سے لگایا۔انہیں اپنے ہمراہ کمرے تک لائے۔آج توشک سلائی کے اس کارخانہ میں سناٹا تھاکوئی کام نہیں ہورہاتھاسناٹے کی حکمرانی تھی۔ مصطفٰیٰ پہلے سے موجود تھے۔میرزابولے!

آج کی رات آخری فیصلہ کی رات ہے۔

ہم آپ کے ساتھ ہیں بس آپ حکم کریں۔

محسن بہت کھری باتیں کرتے،میرزاکوانکایہ انداز پسند تھا۔

میرزانے ایک بار روح اللہ اور مصفطےٰ کے چہروں پر نگاہ ڈالی اور بولے!

اگر ہم ایک "اسلامی تنظیم" کی شکل میں کام کریں تو جوان طبقہ بھی زیادہ جذب ہوگا۔ پھر سامنے رکھے قرآن مجید کو کھولا اور ایک آیت کی تلاوت کی اور بولے!

کہ آئندہ ہمارے تمام اعلانات اور اشتہارات اور پمفلیٹوں پر یہ آیت ضرور لکھی جائے گی۔ پھر ایک لمحہ رک کر بولے!

اور میری نظر میں گروہ کا نام "گروہ توحیدی صف" رکھا جائے۔ یہ نام قرآن سے ماخوذ ہے باقاعدہ انجمن کی تشکیل کی گویا بنیاد رکھی گئی تھی موجود لوگوں کے چہرہ پر ایک اطمینان اور خوشی کا رنگ تھا لیکن میرزا اندر ہی اندر مضطرب تھے کیا ہم آئندہ اس نام کا بھرم رکھ پائیں گے؟ کیا ہم اس نام کے سایہ میں خدا کی خوشنودی حاصل کر سکیں گے.......

"آقا" کی رائے ہمارے لئے مشعل راہ ہوگی میرزا "امام خمینی" سے ملاقات کے لئے بے چین تھے لیکن ابھی تک ایسا موقع نہیں مل پایا تھا۔ شاید "گروہ توحیدی صف" کی باقاعدہ تشکیل اس راہ میں مددگار ثابت ہو میرزا خیالوں کی وادی سے باہر آئے۔ اگلے منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کی آرزو میں وہ گھر سے باہر نکلے۔ میرزا کے لئے یہ ایک یادگار رات تھی۔ سب سے پہلے گلشن مسجد پہونچے۔ مصلّے پر خدا سے راز و نیاز میں مشغول ہوگئے۔ آج کا منصوبہ خطروں سے بھرا تھا۔ پورے منصوبہ کا علم صرف انہیں کو تھا بقیہ جوان صرف اپنے اپنے طے شدہ کاموں سے واقف تھے۔ کسی کو یہ خبر نہ تھی کہ مجموعاً کیا

ہونے والا ہے اور دوسرے کیا کرنے والے ہیں۔ یہ پروگرام بذات خود میرزا کا بنایا ہوا تھا۔ صرف انکی گرفتاری اور زبان کھلوا کر ہی ساواک تمام افراد اور پورے منصوبے سے آگاہ ہو سکتا تھا۔

میرزا بے چین تھے یہ ایک بڑی ذمہ داری تھی وہ سوچ رہے تھے کہ اگر گرفتار کر لئے گئے تو کیا اتنی بڑی ذمہ داری سنبھال پائیں گے؟ "ساواک" کی سخت اذیتوں کے سامنے کیا وہ اپنی زبان بند رکھ پائیں گے؟ سو سے زیادہ جوانوں کی زندگی کا سوال تھا اشکوں سے بھیگے چہرے کو بار بار زمین پر رکھ دیتے! خدایا! تیری پناہ چاہتا ہوں! مجھے طاقت اور حوصلہ عنایت فرما۔ تیری مدد کے بغیر ہم کچھ نہیں کر سکتے!۔ایاک نعبد وایاک نستعین

میرزا کی کامیابیوں کا یہی راز تھا۔ وہ کسی بھی کام کو اپنی طرف نسبت نہیں دیتے تھے خدا پر توکل کرتے اور اسی لئے کبھی مایوسی ان کے قریب بھی نہ پھٹکتی اور یہی چیز انکی شجاعت، دلیری اور تدبر کے نام سے معروف تھی۔

بڑی دیر تک سجدے میں رہنے کے بعد اٹھے، مسجد سے نکلتے وقت اشک بھرے چہرے کو صاف کیا، اب اضطراب کا کہیں کوئی نشان نہ تھا بلکہ چہرے سے بے پناہ اطمینان جھلک رہا تھا۔

پورا شہر اندھیرے کی چادر اوڑھے غفلت کی نیند سو رہا تھا چاروں طرف بظاہر سناٹا چھایا ہوا تھا اگرچہ اس سناٹے کے پس پشت، باطل سازشوں اور ظلم وستم کے خلاف نا جانے کتنے طوفان مچل رہے تھے مزے کی بات یہ تھی کہ شاہ نے یہ دکھانے کے لئے کہ شہر میں امن وامان ہے ستر غیر ملکی خبر نگاروں کو بلا رکھا تھا۔ یہ اسکی حماقت اور بد قسمتی تھی کہ اس نے یہ ڈارمہ دکھلانے کے لئے ۱۵ خرداد کو ہی چنا تھا۔ سن ۱۳٤۲ کے "۱۵ خرداد" کی یاد جس دن شاہ نے انقلابی تحریک کو کچلنے کے لئے قتل عام کا بہیمانہ حکم دیا تھا۔ تما گروہوں کو یکجا کرنے کی باعث بنی تھی خاص طور پر امام خمینی کے ماننے والوں نے اس دن کو ایک یادگار دن کا عنوان دیا تھا۔

آج 1977 کے 5 جون کی رات اور تہران پر چھایا سناٹا کسی آنے والے طوفان کی پیشن گوئی کر رہا تھا۔ میرزا "ری سڑک" پر بڑے اطمینان سے چہل قدمی کرتے ہوئے کہیں چلے جا رہے تھے۔ چلنے کے انداز سے ہر دیکھنے والا سمجھتا کہ کارخانے میں دن بھر کام کرنے کے بعد کوئی تھکا ہارا مزدور اپنے گھر کو لوٹ رہا ہے۔ میرزا نے سڑک کے دونوں طرف اب تک کھلی چند دوکانوں پر ایک سرسری نگاہ ڈالی۔ اس وقت صرف کھانے پینے کی دکانیں ہی کھلی رہ گئیں تھی۔ میرزا کی نظر اس بلانوش شرابی پر پڑی جو سڑک کے کنارہ کھڑا شراب کی بوتل سے پے در پے گھونٹ پر گھونٹ چڑھا رہا تھا۔ میرزا اب ایسے علاقے میں پہنچ گئے تھے جہاں کوئی دوکان نہ تھی سڑک کے دونوں

کنارے غیر آباد تھے یہاں ایک موٹر سائیکل سوار انکا منتظر تھا۔ احد نے میر زا کے سوار ہوتے ہی موٹر سائیکل آگے بڑھادی

میر زانے حکومت کو دہشت میں لانے کے لئے آج ایک ہی رات میں شہر کے مختلف علاقوں میں بم دھماکہ کاانتظام کرر کھا تھا۔ ہر دھماکے کے لئے انجمن کے مختلف افراد کو چھوٹے چھوٹے گروہ میں بانٹ کر الگ الگ ذمہ داریاں دیں گئیں تھی۔ ان سب کار کا رابطہ الگ الگ صرف میر زا سے تھا۔ کوئی گروہ بھی پورے منصوبے سے آگاہ نہ تھا۔ 5جون کی تاریخ اور دھماکے کے لئے مد نظر مقامات میر زا نے ایک ماہ پہلے ہی معین کردیے تھے۔ اس منصوبہ کی خاصیت یہ تھی کہ اگر کسی ایک گروہ کا کوئی فرد گرفتار بھی ہوجاتا ہے تو کسی صورت میں بھی دوسرے گروہ کی نشاندہی نہیں کر سکتا تھا۔ میر زا بھی ایک دھماکے ذمہ دار تھے۔ جسکا وقت انہوں نے سارے دھماکوں کے بعد صبح کے وقت معین کیا تھا۔

سب سے پہلے دھماکے کا وقت نزدیک تھا جسکی ذمہ داری دو بھائی محسن اور حسن پر تھی۔ جن میں سے ایک سرد مزاج اور متین طبیعت، تو دوسرا ہیجانی اور جذباتی طبیعت کا مالک تھا۔ حسن نے گاڑی کی رفتار کم ہی رکھی تھی آدھی رات گزر چکی تھی۔ گاڑی ایک ایسی سڑک سے گذر رہی تھے جس کے دونوں جانب متعدد شراب خانے ابھی

تک کھلے تھے۔ان میں سے ایک معروف شراب خانہ کا مالک آرمینیا کا باشندہ تھا۔سب سے زیادہ بھیڑ اسی کے یہاں ہوتی تھی۔ صبح تک شرابیوں کا تانتا لگا رہتا تھا۔اور باہر سڑک تک نشے میں مست شرابی شور و غل مچاتے اور وہاں سے گزرنے والے عام آدمیوں کو اذیتیں بھی دیتے اور لوٹ گھسوٹ بھی کرتے حسن نے شراب خانے سے کچھ دور ہٹ کر سڑک کے دوسری طرف گاڑی کھڑی کی۔ دونوں گاڑی سے اتر آئے۔فٹ پاتھ پر دور دور تک کوئی نہ تھا۔ حسن نے محسن کو اشارہ کیا وہ شراب خانے کے اندر تک کا جائزہ لینا چاہتے تھے۔آج پہلی مرتبہ وہ اس قسم کی مہم پر مامور کئے گئے تھے۔انہیں کسی کو قتل کرنے کی اجازت نہیں تھی صرف پٹرول بم سے دھماکہ کر کے ہنگامہ برپا کرنا تھا۔شدید بحرانی حالت میں جان بچانے کے لئے ہتھ گولے استعمال کرنے کی اجازت تھی۔ محسن شراب خانے کے ٹھیک سامنے پہنچے۔کاؤنٹر پر بار کا ارمینیائی مالک موجود تھا۔کوئی بھی میز خالی نہ تھی۔شرابی کی بو اور سگریٹ کے دھوئیں سے اندر عجیب سا ماحول بنا ہوا تھا۔ محسن اندر داخل ہوگئے اور انکی تیزی سے گردش کرتی ہوئی آنکھیں کسی ایسے گوشہ کی تلاش میں تھی جہاں دھماکہ کیا جائے تاکہ کوی شدید طور پر زخمی نہ ہو۔ایک گوشے میں شرابوں کے کنٹینر رکھے ہوئے تھے۔ محسن نے سوچا اس سے بہتر کوئی اور جگہ نہیں ہو سکتی "شراب" خود ہی اشتعال انگیز مادہ ہے۔ محسن دروازے کی طرف پلٹ گئے۔ایک ہاتھ سے دروازہ کو کھولتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے "پٹرول بم" کو مد نظر گوشے کی طرف اچھال دیا اور خود

سڑک پر جست لگائی ادھر حسن نے گاڑی کا انجن پہلے ہی سے چالو کر رکھا تھا اور گاڑی کا دروازہ کھول کر کے منتظر تھے۔ چشم زدن میں محسن کے سوار ہوتے ہی وہ بڑی سرعت سے گاڑی آگے بڑھالے گئے۔

زوردار دھماکہ ہوا تھا بار کے دروازوں اور کھڑکیوں کے تمام شیشے ٹوٹ گئے تھے۔ دھماکے سے جن کے نشے اڑ گئے وہ بے تحاشہ باہر بھاگے لیکن پوری طرح نشے میں مست شرابیوں کو کھینچ کھینچ کر نکالا گیا ورنہ وہ جل کر خاک ہو جاتے۔

فائر بریگیڈ کی گاڑیوں کے پہنچتے پہنچتے نہ صرف پورا شراب خانہ جل کر راکھ ہو چکا تھا بلکہ آس پاس کے کئی شراب خانے بھی نذر آتش ہو گئے تھے۔ اطراف میں کھڑے لوگ چہ مگوئیاں کر رہے تھے اور کوئی کہہ رہا تھا کہ میں نے دیکھا وہ دو تھے بم پھینکنے کے بعد فوراً گاڑی پر سوار ہو کر فرار کر گئے۔ ان ہی میں موجود میرزا نہایت آسودہ نظر آرہے تھے۔ اپنے کارخانہ کے پہلے اسلحے کا کامیاب تجربہ انکے نگاہوں کے سامنے تھا اور وہ اس بات سے بھی بہت خوش تھے کے ان کے ساتھی صاف بچ نکلے اور اب ان کے گرفتار ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

"کاخ جوانان" نامی بار کلب میں طوفان برپا تھا۔ نئے نسل کے مغرب زدہ جوان جوڑے تیز موسیقی پر رقصاں تھے۔ لباس اور ظاہری شکل وصورت سے عیاں ہو رہا تھا کہ یورپ

کی ننگی تہذیب نے انہیں اپنا اسیر بنالیا ہے۔ شقاقی کچھ دیر تک اس پاگل پن کو دیکھتے رہے پھر وہاں سے باہر نکل آئے وہ سوچ رہے تھے کہ میرزا صحیح کہتے ہیں یہ لوگ بے گناہ ہیں نقصان پہونچانے کا کوئی مطلب نہیں۔ ان کو یورپ کی اندھی تقلید نے دیوانہ بنادیا ہے۔ پوری عمارت کا جائزہ لینے کے بعد شقاقی سڑک پر واپس آگئے جہاں رحمت موٹر سائیکل کو فٹ پاتھ پر لئے کھڑے تھے پھر دونوں نے کچھ رائے مشورہ کیااور عمارت کی طرف چل پڑے یہاں ایک کمرہ تھا جس میں سے عقبی حصہ سے مختلف مشین کے چلنے کی آواز آرہی تھی۔ یقینا جنریٹر وغیرہ اسی میں ہیں۔ شقاقی نے سوچا اس کمرے کو اسکی مشینوں سمیت دھماکہ سے اڑادینے میں ہی ان لوگوں کا مقصد حاصل ہو جائے گا۔ کمرہ میں چھت کے نزدیک صرف ایک روشن دان نظر آرہا تھا۔ شقاقی نے ایک گرینڈ کی پن نکال کر روشن دان کا نشانہ لیا لیکن اندازہ غلط نکلا گرینڈ چھت کے پاس ٹکرا کر باہر ہی گر گیااور خوش قسمتی سے پھٹا نہیں۔ اس بیچ رحمت کی نگاہ ایک دیوار کے ایک ٹوٹے ہوئے لوہے کے پائپ پر پڑی جس کا قطر بس اتنا ہی تھا کہ گرینڈ بمشکل اس سے گذر جاتا۔ شقاقی نے رحمت کو آگے بڑھتے ہوئے دیکھا اور ان کا ارادہ بھانپ گئے یہ ایک خطرناک کام تھا۔ شقاقی نے ہاتھ اٹھا کرانہیں رکنے کو کہا لیکن رحمت کہاں سننے والے تھے گرینڈ کی پن نکال کر پائپ میں تیزی سے پھینکااور صدر دروازہ کی طرف چھلانگ لگائی لیکن گرینڈ پائپ میں ہی پھٹ گیا۔ ایک زوردار دھماکہ ہوا پوری عمارت اندھیرے میں ڈوب گئی ایک مزید دھماکے نے جنریٹر

کے پھٹنے کی اطلاع دی۔ شقاقی سڑک تک جا پہنچے تھے لیکن رحمت زیادہ پھرتی نہ دکھا سکے۔ بم کے ایک چھرّے نے بائیں پیر کو گھٹنے کے پاس سے بری طرح زخمی کر دیا تھا۔ کچھ دور تک سینے کے بل چلے پھر دائیں پیر پر لنگڑا لنگڑا کر آگے بڑھے۔ شقاقی بھی ان کی مدد کے لئے پلٹ آئے اور بمشکل انہیں موٹر سائیکل پر بٹھایا۔ سب اتنی تیزی سے کیا گیا کہ دھوئیں اور اندھیرے میں بھاگنے پر لوگوں کی نظر ان پر نہ پڑی۔ لڑکے اور لڑکیوں کی خوفزدہ چیخوں کے علاوہ اور کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ رحمت نے شقاقی کی کمر زور سے پکڑ رکھی تھی۔ پولیس گاڑیوں کے سائرن اس وقت چیخے تھے جب ان کی موٹر سائیکل تقریباً. دو کیلو میٹر آگے نکل چکی تھی۔

سید جلال اور امیر استاد ابراہیم ایک دوسرے کے خالہ زاد بھائی تھے یہ دونوں ایک ساتھ مل کر کئی کامیاب مہم سر چکے تھے ابراہیم موٹر سائیکل چلا رہے تھے پیچھے بیٹھے ہوئے جلال کے ہاتھ میں ایک مضبوط اور موٹا ڈنڈا تھا" خراسان" چوک سے آگے نکلتے ہی ابراہیم نے ٹھیک "صادرات بینک" کے سامنے موٹر سائیکل روکی۔ بینک کی گھڑی ایک بجا رہی تھی۔ سید جلال نے چاروں طرف نگاہ ڈالی انھیں دور دور تک کوئی نظر نہ آیا۔ سید جلال آگے بڑھے ایک عدد دستی بم اور ایک عدد پٹرول بم انکے ہاتھ میں تھا بینک کے پاس پہنچ کر ایک بار پھر اطراف کا جائزہ لیا اور دروازہ میں لگے شیشے پر ڈنڈے سے زوردار ضرب لگائی شیشہ ٹوٹنے کی آواز سنّاٹے میں دور تک پھیلی ابراہیم کچھ مضطرب سے نظر آنے لگے

فوراً موٹر سائیکل اسٹارٹ کی ادھر جلال نے پٹرول بم اور گرینڈ کو اندر پھینکا اور جست لگاتے ہوئے موٹر سائیکل پر جا سوار ہوئے۔ ابراہیم نے موٹر سائیکل آگے بڑھائی اور ابھی "منصور روڈ" سے نکل نہیں پائے تھے کہ ایک زوردار دھماکہ سے فضا جھنجھنا اٹھی۔ ٹھیک اسی وقت موٹر سائیکل بھی بند ہو گئی

کیا پٹرول نہیں ڈالا تھا؟

اوہ لگتا ہے ٹنکی میں چھید ہو گیا۔

مہم پر ایسی گاڑیاں لائی جاتی ہیں ؟

فوراً گلی میں نکل چلو کسی کی نظر ہم پر نہ پڑنے پائے !

ایک پتلی سی گلی میں گاڑی کھڑی کر کے سید جلال واپس پلٹے اور بینک کی طرف بھاگ رہی بھیڑ میں جا ملے انہیں بھی اپنی کار گردگی کا جائزہ لینا ہی تھا بینک دھک دھک جل رہا تھا۔ دھوئیں کا ایک غفیر بادل عمارت سے اٹھ اٹھ کر فضا کو مزید خوفناک بنا رہا تھا۔ بینک کی بہت ساری چیز دھماکے کے باعث دور دور تک پڑی تھیں۔ شاہ اور فرح کی ایک ادھ جلی تصویر پر نگاہ پڑتے ہی جلال اپنی مسکراہٹ نہ روک پائے

تبھی دور سے پولیس گاڑی کے سائرن کے آواز آئی پھر جلال وہاں نہ رکے

ادھر میرزا بھی ہر مہم پر کسی نہ کسی طرح پہنچ جاتے اور کامیابی کا جائزہ لینے کے بعد لوٹ آتے۔ انہیں "رحمت" کی فکر تھی۔ اسے کسی اسپتال میں لے جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ لٰہذا میرزا نے شقاقی سے کہا کہ!

رحمت کو "امیر استاد ابراہیم" کے گھر پہنچادیں۔ وہی خاندان قابل اعتماد تھا اور امید تھی کہ وہاں ان کا مداوا بھی ہو سکے گا۔

ابھی دو مزید مہموں کو عملی جامہ پہنانا باقی بچا تھا۔ اگلی مہم میں دھماکہ خیز مادہ کا بہت زیادہ استعمال کیا جانے والا تھا۔ اس مہم کا ذمہ مصطفٰی نے اکیلے لے رکھا تھا۔ دھماکہ کہاں کرنا ہے اس جگہ کی تجویز بھی انہوں نے پیش کی تھی۔ اس وقت وہ ایک منی بس چلاتے ہوئے بڑے اطمینان کے ساتھ فرخ آباد کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اس علاقہ کے چپے چپے سے وہ واقف تھے۔ مصطفٰی نے ایک بار پھر کلائی پر بندھی گھڑی پر نگاہ کی ابھی کافی وقت بچا تھا۔ وہ اطمینان سے دھماکہ کے لئے ضروری اقدامات کر سکتے تھے۔ آبادی سے دور یہ علاقہ پوری طرح اندھیرے میں ڈھکا ہوا تھا۔ ستاروں کی چھاؤں میں ہائی وولٹیج بجلی کے سپلائی کا چالیس فٹ اونچا ٹاور عجیب ہیبت ناک لگ رہا تھا۔ لوہے کے موٹے موٹے پائپوں پر کھڑے اس ٹاور کے سرے سے بجلی کی تاروں کا جال منسلک تھا۔ یہ کچھ تاروں کا سلسلہ تھوڑے فاصلہ پر موجود بجلی گھر تک گیا تھا اور کچھ تار جنوب کی طرف واقع کپڑا مل کو

بجلی سپلائی کرتے اور بقیہ تار شہر تہران کے ایک بڑے حصہ کو روشن رکھتے۔ مصطفیٰ نے ٹاور کے نزدیک گاڑی روکی۔ یہاں نگہبان کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ شاید انتظامیہ کو اس طرف سے کسی خطرہ کا احساس نہ تھا۔ مصطفیٰ نے وہ تھیلا اٹھالیا جس میں آٹھ عدد بھاری بم اور بارودی فلیتہ تھا۔ مصطفیٰ یہ بارودی فلیتہ چھاؤنی سے پار کرلائے تھے جس وقت وہ چھاؤنی میں تھے اسلحے خانے تک انکی رسائی بڑی آسان ہوا کرتی تھی۔ مصطفیٰ نے اطراف پر نگاہ ڈالی اندھیرے کے سوا کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ بڑے اطمینان سے بموں کو تینوں کھمبوں میں باندھتے رہے انہوں نے بموں میں کچھ اس طرح کا باہمی ربط پیدا کردیا کہ سارے کے سارے ایک ساتھ پھٹیں۔ پھر بارودی پٹی کو اندازہ کرکے اس مقدار میں بموں سے منسلک کیا کہ دھماکے آگ لگانے کے دَس(10) منٹ بعد ہوں۔ کام پورا ہوجانے کے بعد مصطفیٰ نے اطمینان حاصل کرنے کے لئے ایک بار پھر ساری چیزوں کا چیک کیا۔ بارودی پٹی کے سرے میں سگریٹ لائیٹر سے آگ لگائی اور سرعت کے ساتھ منی بس کی طرف چل دئے۔ ویسے چہرے کا اطمینان بتارہا تھا کہ وہ عجلت میں نہیں ہیں۔ ٹھیک دس منٹ کے بعد مصطفیٰ نے "دورازہ غار" چوک پر بس روکی ایک بار گھڑی پر نگاہ کی وہ اس جگہ سے دھماکہ کا اچھی طرح مشاہدہ کرسکتے تھے۔ اندھیرے میں مصطفیٰ کو صرف اپنے دل کی دھڑکنوں کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ انہیں یہ خدشہ تو تھا ہی کہ کہیں وہ ناکام نہ رہ جائیں۔ تبھی زوردار دھماکہ ہوا اور مصطفیٰ نے زیر لب اللہ اکبر کہا

دھماکہ تصور سے کہیں زیادہ زوردار تھا۔ ٹاور کے اطراف میں سفید اور نارنجی رنگ کی روشنی کا جھماکا سا تھا جس میں آسمان کی طرف اٹھتے ہوئے گہرے دھوئیں کے بادل دکھائی دے رہے تھے۔ اب ٹاور کے اطراف تو روشنی ہی روشنی تھی لیکن کپڑا مل، بجلی کالونی کے ساتھ ساتھ آدھا شہر تہران اندھیرے میں ڈوب گیا تھا۔ مصطفےٰ زیر لب مسکرا رہے تھے۔ ان کی یہ پہلی مہم تھی جو پوری طرح کامیاب رہی خدا کا شکر کیا پھر بس حرکت میں آگئ تھی۔

میرزا نے دھماکے کی آواز وقت پر سنی۔ دل ہی دل میں مصطفےٰ کو داد دی اس بار محل وقوع کا معائنہ کئے بغیر آج رات کی آخری مہم پر چل دیئے۔ انہیں مصطفےٰ پر بہت بھروسہ تھا۔ مصطفےٰ کا بے باک مزاج انہیں بہت پسند تھا۔

اب تک سارے منصوبے کامیاب رہے تھے۔ اب آخری مہم پیش نظر تھی ایک مرتبہ آسمان کی طرف نگاہ کی نہیں معلوم کہ شکریہ ادا کرنے کے لئے یا اگلی مہم کے پیش نظر دعا مانگنے کے لئے۔ اس وقت میرزا کی گاڑی قزوین چوک سے گزر رہی تھی۔ ان کا پروگرام ٹایر بنانے والے کارخانے "کیان ٹایر" میں دھماکہ کرنے کا تھا۔ آج رات کی تمام مہمات کا مقصد شاہ کے مدعو کئے ہوئے غیر ملکی خبر نگاروں کو ملک کی اصلی صورت حال سے آگاہ کرنا تھا ساتھ ہی میرزا کے مطابق آئندہ کی جنگ کا دیباچہ تھیں۔ "کاخ

جوانان "نامی "کلب "اور ارمینائی شراب خانے میں آج کی رات دھماکہ دراصل حکومت سے ثقافتی جنگ کا اعلان تھا۔ بجلی ٹاور اور ٹایر کے کارخانے کو نیست ونابود کرنا حکومتی اقتصاد کو چیلنج اور "صادرات بانک" کی تباہی سرمایہ داروں کے لئے کھلی دھمکی کا عنوان رکھتی تھی۔ میرزا کو معلوم تھا کہ آج کی رات حکومت مخالف دوسرے گروہ بھی کچھ نہ کچھ کریں گے چنانچہ خیابان رے پر ایک شراب خانہ میں ہونے والا دھماکہ کسی دوسرے گروہ کا ہی کام ہوگا۔

میرزا قپان کے دوراہے سے گزرتے ہوئے ٹھیک کارخانے کے عقبی حصہ میں جا پہنچے کارخانہ کے عقبی حصہ میں ٹائیروں کا انبار تھا نئے ٹائیر بننے کے بعد پہلے یہاں رکھے جاتے۔

میرزا کی اطلاع کے مطابق آج کل انبار پوری طرح بھرا ہوا تھا اس طرف ایک گارڈ پہرا دے رہا تھا۔ لہٰذا میرزا نے احد سے اشارہ میں کچھ کہا۔ احد نے موٹر سائیکل کو بغیر اسٹارٹ کئے داہنی جانب والی دیوار کی طرف ڈھکیلنا شروع کر دیا۔ اس طرف کوئی نہیں تھا دیوار میں تقریباً دس فٹ کی اونچائی پر ایک کھڑکی نظر آرہی تھی جس کے پاٹوں میں شیشہ لگا ہوا تھا۔ احد نے ٹھیک کھڑکی کے نیچے موٹر سائیکل کھڑی کی میرزا موٹر سائیکل کی پچھلی گدی پر کھڑے ہو گئے انہوں نے توازن بنائے رکھنے کے لئے ایک ہاتھ احد کے سر پر رکھا

اور ایک ہاتھ میں گرینڈ پھر دانت سے پِن کھینچی اور پوری طاقت سے شیشہ پر دے مارا۔ شیشہ ٹوٹ گیااور بم اندر گرامیر زانے بغیر کسی فاصلہ کے دوسرا گرینڈ بھی اندر پھینک دیاور اتر کر موٹر سائیکل پر صحیح سے بیٹھ بھی نہ پائے تھے کے احد نے موٹر سائیکل آگے بڑھادی بڑی مشکل سے میر زاخود کو موٹر سائیکل پر روک سکے۔ اگراحد نے ایک لمحہ بھی دیر لگائی ہوتی تو وہ دنوں گرتی ہوئی دیوار کی زد میں آجاتے میر زا بار بار پلٹ کر پیچھے کی طرف دیکھ رہے تھے جہاں شعلوں اور بڑی تیزی سے اٹھتے دھوئیں کے علاوہ اور کچھ نہیں نظر آرہا تھا۔ ٹائر جلنے کی بو بڑی تیزی سے پھیل رہی تھی جس وقت پولیس گاڑیوں اور ڈمکلوں نے چیخنا شروع کیامیر زااور احد محل وقوع سے بہت دور جاچکے تھے میر زا بڑے مطمئن نظر آرہے تھے۔اپنے کارخانے میں بنائے گئے تقریباًسارے گرینڈ شاندار نکلے تھے انکے دھماکوں کی شدت توقع سے زیادہ ہی تھی۔ میر زا کو صرف رحمت کے سلسلہ میں تشویش لاحق تھی۔ وہ سیدھے 'امیر' کے گھر پہنچے۔ رات کا ڈھائی بج رہا تھا مخصوص انداز کے دَقُّ الباب پر ابراہیم نے فوراًدروازہ کھولا انہیں میر زا کا ہی انتظار تھا۔ رحمت کی حالت کچھ اچھی نہ تھی۔ اسے تیز بخار ہو گیا تھا۔ایک خاتون ان کے سرھانے بیٹھیں ٹھنڈے پانی کی پٹّیاں تبدیل کررہی تھیں۔ایک سفید کپڑے سے زخم باندھا گیا تھاجو خون سے پوری طرح سرخ ہو چکا تھا۔خاتون نے میر زا کو سلام کیایہ ابراہیم کی زوجہ تھیں۔جنکا چار سالہ بچہ نزدیک ہی بیٹھا تھاوہ بھی ابھی تک جاگ رہا تھا۔یہی وہ بچہ تھا جسکی جان میر زانے بچائی تھی۔ تین سال

قبل کا واقعہ تھا۔ شدید سردی کے عالم میں ابراہیم اپنی زوجہ کے ساتھ کہیں راستے میں برف باری میں پھنس گئے تھے بچہ کو شدید سردی لگ گئی تھی اور اسکا زندہ بچنا ناممکن لگ رہا تھا۔ ایسے میں میرزا نے بچے کو اپنے اوور کوٹ کے اندر سینے سے لگا کر اُسے تقریباً ایک گھنٹے تک گرمی پہنچاتے رہے تھے۔ اس کے چہرے پر اس وقت تک گرم سانس پھونکتے رہے تھے جب تک ایک دور افتادہ کسی امام زادہ کا مزار نہیں مل گیا تھا جہاں مزید گرمائش کے سامان مہیا تھے ابراہیم کی زوجہ نے انہیں پہچان لیا تھا وہ چاہ رہی تھیں کے بیٹے سے اس کے "محسن" کا تعارف کرادیں اور کہیں کہ یہ آپ کی فداکاری کا نتیجہ ہے کہ یہ ابھی تک زندہ ہے۔ لیکن رحمت کی نازک حالت نے انہیں خاموش رکھا تھا۔

بغیر آپریشن کے مداوا ناممکن ہے، ہڈی چور ہو چکی ہے امیر نے بھی اپنی زوجہ کی تائید کی۔

میرزا بڑے فکر مند نظر آرہے تھے بغیر کچھ بولے گھر سے باہر نکل آئے۔ نزدیک ہی ایک ٹیلی فون تک گئے نا جانے کس کو فون کیا واپس آئے

صبح تک انتظار کرنا پڑے گا۔ ایک قابل اعتماد ڈاکٹر ہے اسی کے ذریعہ رحمت کو کسی اسپتال میں بھرتی کرانا پڑے گا۔

شقاقی جو بڑے مضطرب نظر آرہے تھے بولے !

اسپتال میں کہیں گے کیا؟

تم دونوں کا ایک موٹر سائیکل سے ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔

لیکن ڈاکٹر کو حقیقت پتا ہونی چاہئے۔

ڈاکٹر قابل اعتماد ہے اسے بتا دیں گے میرزا نے رحمت کے سر پر ہاتھ پھیرا اور جھک کر ماتھا چومتے ہوئے بولے!

تمہیں ڈر تو نہیں لگ رہا ہے۔

مجھے آپ کی فکر ہے یہاں زیادہ نہ ٹھہریئے ۔

میرزا نے یہ سنتے ہی بے تحاشہ رحمت کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ رحمت جی بھر کے روئے میرزا نے اسے رونے دیا تاکہ اسکا دل ہلکا ہو جائے جب رحمت کو کچھ سکون مل گیا تو میرزا نے انہیں دوبارہ بستر پر لٹا دیا اور بولے!

ہم لوگ خدا کے لئے کام کر رہے ہیں گھبرانے کی کیا ضرورت ہے!

میں نے احتیاط سے کام نہیں لیا۔

تمہارا پہلا تجربہ تھا اس عنوان سے بہت اچھے رہے۔ لیکن یاد رہے کہ بات سنا کرو!

میرزا نے ایک بار پھر رحمت کی پیشانی چومی پھر کچھ ضروری ہدایتیں دے کر وہاں سے چل دیئے۔

اگلے دن فیاض بخش نامی ایک جوان ڈاکٹر نے رحمت کا آپریشن کیا وہ یہ جان کر کہ ایک انقلابی کا علاج کر رہا ہے بہت خوش نظر آرہا تھا۔ یہاں تک کہ مداوا مکمل ہو جانے کے بعد جب شقاقی نے نوٹوں کی ایک گڈی اس کی طرف بڑھائی تو وہ بولا !

یہ لوگ ہمارے لئے جان دے رہے ہیں اور میں ان سے پیسہ لوں ہر گز نہیں۔

ڈاکٹر کے اس جملے نے رحمت کو مزید سکون اور آسودگی عطا کی تھی۔

مقلد آقا

اب نقل مکانی ناگزیر ہو گئی تھی۔اب تو اس گھر کا مالک مکان "علی آقا" بھی ان کی سرگرمیوں سے آگاہ ہونے کی فکر میں لگ گیا تھا۔اب اس گھر میں مزید خفیہ کام خطرہ سے خالی نہ تھا۔ میرزا نے اس گھر کو چار ہزار تومان کرایہ پر لیا تھا ایک بڑا صحن اور دو بڑے کمرے تھے۔ لحاف گدے بنانے کے علاوہ گروہ کے سارے جلسہ یہیں ہوتے، میرزا نے گدوں کی سپلائی میں کبھی کمی نہیں آنے دی تھی کیوں کہ یہ تجارت ان کی انقلابی سرگرمیوں کے لئے بہترین پناہ گاہ بنی ہوئی تھی۔ یہی نہیں بلکہ گروہ سے تعلق نہ رکھنے

والے کاریگر اب بھی کاموں میں لگے ہوئے تھے۔ میرزا نے ان کے ساتھ ساتھ محلے والوں سے معاشرت کبھی ترک نہیں کی تھی۔ میرزا نے گروہ کے کافی لوگوں کو اسی تجارت کی آڑ میں انقلاب سے جوڑا تھا۔ تہران کے دور دراز علاقہ کے جوانوں سے انکا رابطہ تھا لیکن میرزا کا طریقہ کار اپنی طرز کا تھا۔

انجمن مختلف چھوٹے چھوٹے گروپوں میں بٹی ہوئی تھی۔ میرزا کی یہ حفاظتی تدبیر بڑی کار گر تھی۔ یہی نہیں بلکہ اگر مختلف گروہوں سے ایک ساتھ میٹنگ کرنی ہوتی تو سارے اعضا اور اپنے چہرے پر اس طرح کی نقاب لگاتے جس سے محض آنکھیں ظاہر ہوتی تھیں۔ آج کے جلسہ میں چار آدمیوں کو شریک ہونا تھا۔ محسن، مصطفےٰاور روحُ اللہ تینوں کے آجانے کے بعد میرزا نے آئندہ کے منصوبہ پر بات شروع کی۔ میرزا اب حکومت مخالف سرگرمیوں کا دائرہ مزید بڑھانا چاہتے تھے۔ ان کے مطابق عوام حکومتی خفیہ ایجنسیوں سے بہت خائف تھی اور اب وقت آگیا تھا کہ یہ بت توڑ دیا جائے۔ میرزا نے تخریب کاری کے دائرہ کو مزید بڑھانے کی پیش کش کی۔ وہ بولے!

ہم تہران، آذر بائیجان، اصفہان، خوزستان اور خراسان صوبوں میں کاروائیاں کر سکتے ہیں۔

محسن متعجب ہوئے۔ وہ سوچنے لگے کیا گروہ توحیدی صف اتنی قوت جمع کر سکتا ہے؟ لیکن انہیں میرزا پر پورا بھروسہ تھا۔ وہ جانتے تھے کہ میرزا کے لئے یہ بات یقینا ممکن ہو گی ورنہ وہ یونہی کچھ نہ کہتے۔ لہٰذا چپ ہی رہے۔

اچھا رہے گا کئی صوبوں میں ایک ساتھ کاروائیوں سے حکومت حواس باختہ ہو جائے گی اور اسکی خفیہ ایجنسیوں کی پوری توجہ جو صرف تہران پر مرکوز ہے مختلف صوبوں میں بٹ جائے گی۔

میرزا پھر بولے! "سامازن" میں "گرینڈ" کے کاخانے کو مزید تقویت دی جائے گی۔ اسلحہ خریدنے کا کام بھی جاری رہے گا۔ آپ حضرات افراد کی ٹریننگ پر زیادہ توجہ دیجئے۔ "رحمت" کا زخمی ہونا اسکی ناتجربہ کاری کی بنیاد پر تھا۔ جتنے افراد ہم سے جڑے ہیں انہیں سب سے پہلے مکمل ٹریننگ دی جائے۔ ہم مختلف قسم کی ٹریننگ کا انتظام کر سکتے ہیں

یہ اس وقت 1975 کی بات تھی جب حکومت کے خلاف حملوں میں بڑی کثرت سے اضافہ ہوا تھا۔ لہٰذا حکومتی خفیہ ادارے بری طرح سے سرگرم تھے ایسے میں میرزا کوئی خطرہ نہیں لینا چاہتے تھے۔ لہٰذا مزید زور دیتے ہوئے بولے!

ہم لوگوں کو بڑے پیمانے پر حملے کرنے چاہئے۔ اسکا سب سے بڑا مقصد عوام کا دل بڑا کرنا ہے۔ اگر پولیس چوکیوں، فوجی چھاؤنیوں اور حکومت کے بڑے مراکز پر حملے ہوتے رہے

تو کثیر تعداد میں لوگ یہ سوچ کر انقلاب سے جڑ جائیں گے کہ حکومت کا مقابلہ کرنا ناممکن یا محال نہیں ہے۔ میں نے آقا کے آخری بیان سے یہی اخذ کیا ہے کہ جب تک عام آدمی میدان میں نہیں آئے گا صرف سیاسی انجمنوں اور مسلح گروہوں سے کچھ ہونے والا نہیں ہے۔ عوام کو میدان عمل میں آنا ہو گا۔ اگر گنتی کے لوگ چھوٹی بڑی انجمنیں بنا کر شاہی حکومت سے ٹکرائیں گی اور انہیں عوامی حمایت حاصل نہیں ہو گی تو آج نہیں تو کل ظالمانہ طریقہ سے ایک ایک کر کے موت کے گھاٹ اتار دئے جائیں گے۔ ہم لوگوں کو اپنے آپ میں محدود نہیں رہنا ہے ورنہ ہمارا حال بھی "مجاہدین خلق" جیسا ہو گا۔

ضروری ہے کہ ہم "آقا" سے ارتباط رکھنے والے علماء کے توسط سے انقلاب کو آگے بڑھائیں۔ مزید منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے پیسوں کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے ایک بینک میری نظروں میں ہے۔ پھر میرزا نے محسن سے کہا کہ وہ جلال کے ساتھ اس منصوبہ پر کام کریں۔

بینک لوٹنے کا منصوبہ عملی جامہ پہننے والا تھا کئی آدمی بینک سے لگی گلیوں میں ایک دوسرے سے اجنبی بنے ٹہل رہے تھے۔

صرف بینک کے سامنے تھوڑی روشنی تھی ورنہ چاروں طرف اندھیرا ہی تھا۔ بازار کی شاید ہی کوئی دوکان تھی جس نے اپنی دوکان کے سامنے والے بلب کو جلتا چھوڑا ہو مخصوص اشارے سے محسن نے جلال کو اپنے نزدیک بلایا۔

سب ٹھیک چل رہا ہے؟

ہاں! بس آپ کے اشارے کے منتظر ہیں۔

محسن نے مزید کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ ایک تیز رفتار موٹر سائیکل کی آواز آئی وہ اسی جانب چلی آرہی تھی۔

یہ کون ہو سکتا ہے؟ یہ کہتے ہوئے ہی محسن اور جلال ایک کھمبے کی اوٹ میں چلے گئے۔ موٹر سوار بڑی عجلت میں لگتا تھا۔ ٹھیک بینک کے صدر دروازے پر موٹر سائیکل روکی تھی۔اور ہلمیٹ اتارا ہی تھا کہ محسن نے تعجب سے کہا!

میر زا! یہ تو منصوبے میں شامل نہ تھے؟

میر زا نے محسن اور جلال کو آواز دی ہی تھی کہ وہ لوگ ان کے پاس پہنچ چکے تھے اور سوالیہ انداز سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ میر زا نے سانسوں پر قابو پاتے ہوئے کہا!

لوٹ جاؤ! سب لوگ لوٹ جاؤ! اس منصوبے پر عمل نہیں کیا جاسکتا

لیکن کیوں سب کچھ تیار ہے ؟ہم بیس روز سے اس پر کام کر رہے تھے اور آپ آج کہتے ہیں یہ کام نہیں ہو سکتا آخر کیوں ؟میں نے آقا کے ایک نزدیکی سے پچھوایا تھا۔آقا نے فرمایا:

یہ کام صحیح نہیں ہے چوری بہر حال حرام ہے

ہم اللہ کی راہ میں چوری کے مال سے جہاد نہیں کریں گے۔ سب سے کہو کے لوٹ جائیں امام خمینی کا نام آتے ہی سب خاموش ہو گئے۔ اب بحث کرنا بے کار تھا۔ سب نے ایک دوسرے کو اشارہ کیا کہ وہ اپنے اپنے ٹھکانوں پر واپس چلے جائیں سب چلے گئے لیکن میرزا بینک کے پاس ہی زمین پر بیٹھ گئے۔انکی آنکھوں سے اشک جاری تھا وہ اسی قسم کی لغزشوں سے بہت ڈرتے تھے۔

میں کیا کرنے جارہا تھا؟ میں نے گروہ کو کس غلط کام پر مامور کر دیا تھا۔ خدایا تو ہی مدد کرنے والا ہے یہ تیرا کرم تھا ورنہ آج یہ غلط کام ہو جاتا اور سکی گمراہی کا سبب میں ہوتا پھر انہوں نے "آیۃ اللہ شاہ آبادی" سے ملاقات کا ارادہ کیا۔ایک سال ہوا کہ آقا شاہ آبادی سے میرزا کی آشنائی ہوئی تھی۔ جب بھی میرزا کسی مشکل میں پڑتے ضرور ان کے پاس جاتے۔

میرزا گروہ کے کاموں سے مطمئن تھے۔ کچھ دن پہلے انہوں نے امام خمینی کوایک خط لکھا تھا جن میں امام خمینی سے اپنے ان اگلے پانچ منصوبوں کے صحیح یاناجائز ہونے سے متعلق استفسار کیا تھا جنہیں پانچ مختلف صوبوں میں جلد ہی عملی جامہ پہنایا جانا تھا۔

کیونکہ ان مہموں کی کامیابی کا مطلب فوج کے مختلف مرتبوں کے متعدد افسران کی یقینی موت تھا۔ مختلف چھاؤنیوں کے نقشے، وہاں کی روزمرہ کی سرگرمیاں، مختلف افسران کے آمد ورخصت کے اوقات اور بھی چھوٹی چھوٹی باتوں کی پوری اطلاع حاصل کرلی گئی تھی۔ مصطفےٰ اس کام کے اصلی ذمہ دار تھے۔ گروہ کا اصفہانی جتھہ سب سے زیادہ آمادہ نظر آرہا تھا۔ میرزا نے گروہ کے تمام اعضاء کو پوری طرح ہر وقت تیار رہنے کا حکم دے رکھا تھا۔

ادھر کارخانہ میں حمید اور بیک زادہ نے صبح شام ایک کررکھی تھی۔ یہاں تک کہ پیش نظر منصوبہ کے لئے جتنے گرینڈ کی ضرورت تھی اس سے کہیں زیادہ تعداد میں تیار کئے جاچکے تھے۔ یہ ہتھ گولے روزآنہ بڑی تیزی سے مذکورہ پانچوں صوبوں میں پہنچائے جارہے تھے تاکہ تعادل برقرار رہ سکے۔ پورا گروہ نہایت جوش وجذبہ سے سرگرم عمل تھا۔ میرزا یہ سب دیکھ کر خدا کا شکر ادا کرتے۔ اپنی سنگین ذمہ داری کے تئیں اس کی بارگاہ میں دست دعا بلند کرتے۔ صرف تین مہینہ میں انجمن کہاں سے کہاں جاپہونچی۔ پروردگار

کی خاص توجہ کے بغیر یہ کام ممکن نہ تھایہی زمانہ تھاجب ان کادوسرابیٹااس دنیامیں آیاوہ کوشش کرتے کہ اپنی زوجہ کواسپتال میں تنہانہ چھوڑیں۔بیٹے کانام انہوں نے "حسین" رکھا تھااس رات مبارک باد کے لئے سب میرزاکے پاس جمع ہوئے۔میرزاابھی ابھی اسپتال سے لوٹے تھے۔ابھی ان کوامام خمینی کے نمائندہ سے ملاقات بھی کرنی تھی۔وہ اپنے مذکورہ خط کے جواب کے لئے بہت مضطرب تھے۔

لوگ مبارک باد دے رہے تھے۔ظاہراًتومیرزامسکرارہے تھےاور لوگوں کا شکریہ بھی اداکررہے تھے لیکن ان کے ذہن میں صرف ایک سوال گونج رہاتھاامام نے کیا جواب دیاہوگا؟وہ ایک بار پھراسپتال گئے کیوں کہ ملاقات کی مشروط جگہ جاتے وقت اسپتال راستے میں ہی پڑتاتھاوہ بچے کوپیار کررہے تھے،بیوی کوسہارادے رہے تھے،ماں بھی وہیں موجود تھی بھلاماں سے دل میں اٹھنے والے طوفان کوکون چھپاسکتا تھا۔میرزاکی حالت دیکھ کربولیں!

بیٹاکیاہوابہت پریشان ہو۔آتے ہواور فوراًپھر چلے جاتے ہو!ارے!اپنے بیٹے کوگود میں لوکچھ سکون مل جائے گا۔

تمہاراجسم یہاں پرہے تمہاری روح کہیں اورہے۔

میرزا مسکرائے کچھ بولے نہیں۔ ایک طرف مضطرب ماں کی محبت آمیز نگاہیں ان پر تھیں تو دوسری طرف بیوی کی شکایت بھری نظریں جن سے ظاہر تھا کہ وہ میرزا سے نہ جانے کتنے سوالات کرنا چاہتی ہیں میرزا بچے کی طرف دیکھ رہے تھے پھر انہوں نے کھڑکی کی طرف نگاہ کی اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ماں کے ہاتھ چومے اور بولے!

میرا جانا بہت ضروری ہے۔آپ یہیں رکی رہیئے گا۔میں کل دن میں آؤں گا!

ہاں اگر نہ جاؤ گے تو دنیا تباہ ہو جائے گی۔اچھا جاؤ میں یہیں ہوں اور ہمیشہ کی طرح تمہاری منتظر۔

میرزا خدا حافظی کر کے تیزی سے باہر نکلے باہر وہ جسکے منتظر تھے وہ موجود تھا۔ اس سے لفافہ لیا اور رسمی قسم کی گفتگو کے بعد تیزی سے ایک گلی میں مڑ گئے جس کا دوسرا سرا "مولوی روڈ" پر جاتا تھا۔ جہاں مصطفےٰ اپنی بس میں ان کے منتظر تھے میرزا بس پر بیٹھتے ہوئے بولے!

چلو آقا کا جواب آگیا۔

دونوں "خراسان چوک" پہونچے شہباز جنوبی موڑ پر واقع ایک گھر میں داخل ہوئے وہاں گروہ کے مختلف افراد موجود تھے۔ سب سے پہلے بیک زادہ سے ملاقات ہوئی وہ بولے!

میرزاآپ نے کافی دیر کردی۔

کیاوہ لوگ آگئے ہیں؟

ہاں تقریباًآدھا گھنٹاپہلے ہی اصفہان والے آگئے تھے۔

میرزا تیزی سے آگے بڑھے اور ایک کمرے تک پہونچے۔ ابھی تک اصفہان کے تمام افراد ان سے آشنانہ تھے۔ لہٰذاانہوں نے اپنے اور مصطفیٰ کے چہرہ پر نقاب نماایک خول ڈال رکھا تھاجس سے صرف دوآنکھیں ظاہر ہوتی تھیں

اپنی آمد سے باخبر کرنے کے لئے یااللہ کہتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے سامنے تین افراد تھے میرزاان کواچھی طرح پہچانتے تھے۔ ایک سلمان تھاجو اصفہان میں توحیدی صف کی ذمہ داری سنبھالتا تھا۔ ایک جذباتی نفسیات کامالک۔ اس کے ایک جانب مھدی ھاشمی تھے اور دوسری جانب ایک عالم دین جنکا نام منتظری تھا۔ یہ دوافراد مسلح کارروائیوں میں کافی تجربہ رکھتے تھے۔

سلام کا ردّ و بدل ہوا۔ میر زا ایک طرف بیٹھ گئے۔ اور مصطفیٰ کو اشارہ سے اپنے پاس بیٹھنے کو کہا میر زا نے کوٹ کے اندرونی جیب سے ایک خط نکالا۔ مصطفیٰ کی بے چینی بڑھتی جارہی تھے کہ آقا نے کیا جواب دیا ہے۔ میر زا نے سب سے پہلے بغیر آواز کے خود ہی خط پڑھا ان کے چہرے پر اضطراب کا ایک رنگ آیا اور فوراً ہی عزم و ہمت کے آثار نے اس کی جگہ لے لی۔ کچھ بھی ہو آقا کا جواب ہے سب کو سنانا ہی پڑے گا۔ وہ سب کے چہرے پر باری باری نگاہ کر کے بولے !

یہ منصوبہ آقائی مصطفیٰ کا بنایا ہوا ہے جو آپ لوگوں کے سامنے بیٹھے ہیں انہوں نے نہایت مہارت کے ساتھ یہ محفوظ منصوبہ تیار کیا تھا۔ ان پر مجھے بھی بہت اطمینان اور اعتماد ہے سلمان نے پر جوش انداز میں کہا !

ہم لوگ بھی آقا مصطفیٰ کی مہارت پر ایمان رکھتے ہیں۔ اسی لئے اصفہان سے یہاں آئے ہیں تاکہ ان سے مزید مشورہ کر سکیں۔

میر زا نے ایک لمحہ کا سکوت اختیار کیا اور بولے ! لیکن اسی وقت سے اس منصوبے پر کام روک دیا جائے گا۔

کیوں ؟ کیا بات ہے ! ہم اتنی دور سے یہ جواب سننے کے لئے نہیں آئے ہیں۔

مصطفٰی ابھی مضطرب نظر آرہے تھے۔ میر زا نے مزید کچھ کہنا چاہا لیکن اس سے پہلے ہی سلمان پھر بول پڑا!

ہم لوگ تین مہینے سے زیادہ سے اس منصوبہ پر کام کر رہے ہیں۔اصفہان کا ہوائی اڈّہ پوری طرح ہمارے نشانے پر ہے۔

میر زابولے !آ قا کا حکم ہے اس منصوبہ کو عملی جامہ نہیں پہنایا جاسکتا۔

کیوں؟اس میں کیا کمی تھی؟

میں آ قا کے الفاظ پڑھتا ہوں میر زا نے پڑھنا شروع کرنے سے پہلے مصطفٰی کی طرف دیکھا جن کی آنکھوں سے بے چینی مترشح تھی۔

"کسی کو حق حاصل نہیں ہے کہ فوجیوں کو کوئ گزند پہنچائے حتیٰ کسی فوجی کو توہین آمیز الفاظ سے یاد کرے"

کمرے کی فضا میں ایک بار قبرستان کا سا سناٹا چھا گیا تھا۔ سب خاموش تھے پھر میر زا نے مصطفٰی کی جانب دیکھتے ہوئے بلند آواز سے کہا !

آ قا نے تمہارے منصوبہ کو رد کر دیا ہے لگتا ہے آ قا فوج کے مقابلہ میں سخت رویہ اختیار نہیں کرنا چاہتے۔آپ کیا کہتے ہیں آ قا مصطفٰی؟

یہی سوال میں اآپ سے کرناچاہتاہوں ؟مصطفےٰ نے وہی سوال خود میرزا سے کرڈالا۔

میرا نظریہ آقا کی اطاعت ہے۔

میں بھی آقا کی مخالفت نہیں کر سکتا۔

مہدی ہاشمی جو ابھی تک خاموش تھا سلمان پر غضبناک نگاہیں ڈالتے ہوئے بولا !

امام نجف میں ٹھیک ہیں۔انہیں اس ممانعت کی وجہ بھی بتانی چاہیئے تھی۔یہی ہوتا ہے جب رہبر خود معاشرے میں نہ ہو مہدی ہاشمی نہ جانے اور کیا کیا کہہ ڈالتاا گرآقا منتظری بیچ میں اسے نہ ڈانتے۔انہوں نے مہدی ہاشمی کو چپ کرانے کے لئے بلند آواز میں کہا

تم کو کوئی حق نہیں ہے کہ آقا کی توہین کرو، تم اپنی اس اکڑ سے خسارے میں رہو گے۔

ہم یہاں آئے تھے تاکہ اپنے اتنے بڑے منصوبے پر آخری گفتگو کریں یہاں تو.........وہ پھر بولا لیکن نہ جانے کیا سوچ کر اسنے اپنا جملہ آدھا چھوڑ دیا۔

محمد منتظری نے بلند آواز میں کہا!

لیکن اب ولی فقیہ کا جو حکم ہے بس وہی ہوگا منتظری کی باتوں نے میرزا کو بڑا سکون پہنچایا تھا۔

ہاشمی اور سلمان جانے کے لئے کھڑے ہو گئے تھے۔ کمرے سے نکلتے وقت ہاشمی بولا!

ہمارا راستہ آپ لوگوں سے الگ ہے۔ جس کو جو سمجھ میں آئے کرے۔

میرزا کو سلمان سے یہ توقع نہ تھی۔ یہ پہلا واقعہ تھا جب گروہ توحیدی صف کے اعضاء کے درمیان اس قسم کا اختلاف پیدا ہوا۔ وہ تینوں گھر سے نکل گئے۔ میرزا صحن خانہ میں ٹہلنے لگے ان کی آنکھوں میں فکر مندی صاف پڑھی جا سکتی تھی۔ یقیناً ایسے بہت سے افراد جی جان سے اس منصوبہ میں لگے ہوئے تھے۔ امام خمینی کے حکم کو سن کر رنجیدہ ہو سکتے ہیں۔ میرزا خود بھی بہت پریشان تھے۔ آقا نے آخر فوج کی نسبت یہ رخ کیوں اختیار کیا؟ کیا آقا کو فوج سے کچھ امید ہے؟

لگتا ہے آقا کے پاس فوج کے متعلق گہری معلومات ہیں۔ شاید خود فوج میں آقا کے نمائندہ موجود ہیں اور خاموشی سے کاموں میں مشغول ہیں؟۔ اب میرزا کے سامنے اس منصوبہ کو رد کئے جانے پر گروہ کے اعضاء کو سنبھالنا یہاں تک کہ وہ آقا کی نسبت بدبینی کا شکار نہ ہو جائیں ایک مسئلہ تھا۔ وہ اس بحرانی کیفیت میں خود کو ہی ذمہ دار مان رہے تھے اگر شروع میں ہی آقا سے کسی طرح سے دریافت کر لیا ہوتا تو آج ایسے حالات پیدا نہ ہوتے۔

میرزا ٹہلتے ٹہلتے رک گئے۔اور مصطفیٰؒ سے بولے!

تمام اعضاء کو مطلع کردیجئے کہ کوئی قدم نہ اٹھائیں۔

سب مایوس ہو جائیں گے۔

اللہ ہی مالک ہے اسی سے مدد مانگئے آقا مصطفیٰؒ۔اور ہاں اگلے کسی پروگرام سے پہلے اصفہان برانچ سے رابطہ نہیں کیا جائے گا۔

ہم منتظر رہیں گے یہ لوگ خود ہی آقا کے متعلق اپنا نظریہ صاف صاف ظاہر کردیں۔

یہ مہدی ہاشمی خطرناک آدمی ہے۔

مصطفیٰؒ تو آج ہی پہلی مرتبہ اس سے ملے تھے۔ میرزا کی باتیں سن کر خاموش ہی رہے۔ میرزا پہلی بار خود کو بے بس محسوس کر رہے تھے۔ پھر میرزا شہر سے باہر کہیں چلے گئے۔ دو روز تک وہ کسی سے نہ ملے مختلف افکار کا ہجوم تھا ان کے ذہن پر۔ وہ گروہ کے اعضاء کی نفسیاتی کیفیت کا اندازہ لگا سکتے تھے۔ سب اعلیٰ فکری کے مالک نہ تھے۔ مہدی ہاشمی کا جملہ ان کے دل پر نشتر چلا رہا تھا۔ میرزا خود سے مخاطب ہوئے۔

میں گروہ توحید صف کو چھوڑ دینا گوارہ کرسکتا ہوں لیکن آقا کے بارے میں کوئی اس حد تک بکواس کر جائے یہ برداشت نہیں کرسکتا۔ تمام افراد سے بات چیت کرنا بہت ضروری

ہے۔اس منصوبے کے لئے نہایت ہی جوش و خروش کے ساتھ وہ لوگ سر گرم تھے۔اب اس حکم کے بعد وہ سب مایوسی کے شکار ہو سکتے ہیں۔ان سب کو کس طرح سنبھالوں؟

میرزا براہ راست اور بروقت آقا سے راہنمائی چاہتے تھے لیکن یہ کیسے ممکن ہو۔ان کے سامنے ایک سوال تھا۔انہوں نے آیۃاللہ بہشتی نامی عالم دین سے بھی ملاقات کی۔جو آقا کے نزدیکی شمار کئے جاتے تھے۔لیکن ان سے بھی تسلی بخش جواب نہ مل دکا۔ آیۃاللہ شاہ آبادی تو میرزا کے سوالات سن کر خاموش ہی رہے۔ایسے میں میرزا کی مشکلوں کا حل صرف "آقا" کے پاس ہی تھا۔انہوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اب ایران میں کوئی ان کی مدد نہیں کر سکتا لہٰذا عراق جانے کا پروگرام بنالیا۔اور سیدھے آقا کے سامنے اپنی مشکلات پیش کرنے کا ارادہ کیا۔

جیل

1973 میں امام خمینی سے ملاقات کے لئے عراق جاتے وقت سرحد پر گرفتار کئے جانے کے بعد میرزا کو اسمگلنگ کے جھوٹے کیس میں بھی پھنسا دیا گیا تھا ورنہ ان کا جرم حکومت کی دو سالہ لازمی "خدمت" سے فرار کے سوا کچھ نہ تھا

نقاہت و کمزری سے انکی آنکھوں کے گرد سیاہ ہالے پڑ گئے تھے۔ پیر میں بندھی رسی نے جلد کاٹ کر گوشت تک رسائی حاصل کرلی تھی۔ الٹے لٹکے کافی دیر گذر چلی تھی پورے جسم کا بھار پیر کے گٹّوں پر تھا۔ جب کبھی رسی گھومتی تو میرزا کسی قسم کی مزاحمت نہ کرتے اور اسی کے ساتھ ساتھ چکر کاٹتے رہے۔ پوچھ تاچھ کرنے والا انسپکٹر تھک کر آرام کرنے چلا گیا تھا۔ میرزایوں الٹے لٹکے رہنے میں ہی اپنی عافیت دیکھ رہے تھے کیوں کہ ابھی تک ان پر گھونسوں اور کوڑے کی بارش نہیں کی گئی تھی کئی مرتبہ ان سے اعتراف سنے کی ناکام کوشش کی جاچکی تھی۔ رسی کافی دیر سے گھوم رہی تھی آخرکار ان پر غشی طاری ہوگئی۔

لیکن تھوڑی دیر بعد چہرے پر پڑنے والے ایک بالٹی ٹھنڈے پانی سے وہ ہوش میں آگئے تھے لیکن اس بار خیریت نظر نہیں آئی تھی الٹے لٹکے ہی انہوں نے ایک خونخار پولیس والے کو دیکھا جو ہاتھ میں ایک کوڑا لئے ہوئے ان کی طرف آرہا تھا۔ پھر اس کے بعد اپنی چیخوں پر قابو نہیں کرسکے اور پھر چیخوں کا سلسلہ انکی بے ہوشی پر ٹوٹا۔ کافی دیر بعد ہوش آیا لیکن ذہن میں کچھ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پوری طرح پیدا نہیں ہوئی تھی پھر دھیرے دھیرے بدن کے مختلف حصوں میں آگ سی لگتی محسوس ہوئی۔ کوڑے پڑنے کی جگہ سے جلد غائب ہوگئی تھی اور زخموں سے ابلنے والے خون میں وہ پوری طرح نہاگئے تھے۔ بڑی دیر تک ضبط کئے رہے آہ بھی نہ کی لیکن ایک بارگی بڑی زور سے چیخے

اے درندوں مجھ سے کیا چاہتے ہو! مجھے نیچے اتارو!

ایک ادھیڑ عمر کا سادہ لباس والا سپاہی اندر داخل ہوا اور میرزا کے سامنے آ کے کھڑا ہو گیا۔

لگتا ہے تمہاری عقل اب ٹھکانے آ گئی ہے لونڈے۔

میرزا کو صرف اسکی آواز سنائی دے رہی تھی آنکھوں پر بہنے والے خون کی وجہ سے وہ اس وقت کچھ نہیں دیکھ پا رہے تھے آنکھوں کو بار بار کھولتے اور بند کرتے تاکہ اس شخص کو دیکھ سکیں ایک بار پھر بولے:

اے ذلیل درندے اگر میرے ہاتھ کھلے ہوتے تو میں تجھ سے سمجھ لیتا۔

انسپکٹر بیٹھ گیا اور اپنا چہرا ٹھیک میرزا کے چہرے کے مقابل لا کر بولا!

کب تک جھوٹ بولتے رہو گے لڑکے۔

میں نے کیا جھوٹ بولا؟

پولیس والا قوی الجثہ اور تجربہ کار تھا۔ میرزا کی خود اعتمادی بھری نگاہوں سے اس نے بالکل درست اندازہ لگا لیا تھا کہ میرزا کس قسم کے آدمی ہیں لیکن کسی قسم کا ثبوت نہ ہونے کی بنا پر وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا اور شدید اذیتیں پہنچانے کے بعد بھی میرزا سے کچھ

اعتراف نہ لے پانے نے اس پر مزید کھجلاہٹ سوار کر دی تھی۔ لہٰذا اپنی حیثیت کو بچائے رکھنے کے لئے میرزا پر عراق سے اسمگلنگ کرنے کا جھوٹا الزام عائد کر دیا تھا۔

اس نے ایک اردلی کو آواز دی اور اشارہ سے میرزا کو نیچے اتارنے کا حکم دیا۔اس اردلی کو میرزا کی حالت پر بڑا رحم آرہا تھا لہٰذا اس نے میرزا کو آہستہ آہستہ نیچے اتارنا شروع کیا لیکن یہ بات اس انسپکٹر کو اچھی نہیں لگی اس نے غصہ میں آکر اردلی کو ایسا دھکا دیا کہ رسی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور میرزا سر کے بل پکی زمین پر گرے۔

ساواکی ایک کرسی گھسیٹ کر میرزا کے پاس بیٹھ گیا۔ خون کافی مقدار میں بہہ چکا تھا اس پر بھوک اور پیاس کی شدت نے میرزا کو نہایت ضعیف بنا دیا تھا۔ بڑی مشکلوں سے آنکھیں کھولیں۔ ساواکی ابھی بھی ان کے سر پر سوار تھا

تم اب بھی نہیں بولو گے ! بتاؤ کیوں عراق جا رہے تھے ؟ ٹھیک ہے کہ تم "حکومت کی لازمی خدمت" سے فرار کر رہے تھے لیکن تم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ ملک سے ہی کیوں نکل جانا چاہتے تھے ؟ عراق میں کس سے ملاقات کا اردہ تھا؟

بتایا تو میں ایک غریب گھر کا ہوں۔ مزدوری سے گھر کا خرچہ چلنا مشکل تھا۔ چاہتا تھا کہ اسمگلنگ کے دھندھے میں لگ جاؤں۔

اگر تم کو چھوڑ دیا جائے تو تم پھر اسمگلنگ کی سوچو گے ؟

کیوں نہیں اس کے علاوہ میرے پاس اور کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔ایک پرانی گاڑی تھی اسے بیچ کر ہی ایجنٹوں کے ذریعہ عراق نکلنا چاہتا تھا کہ گرفتار کر لیا گیا۔اب تو میرے پاس کچھ بھی نہیں بچا

میرزا بڑے نرم لہجے میں جواب دے رہے تھے کہ شاید اس درندے کو کچھ رحم آجائے۔ ان کو لگ رہا تھا کہ اب جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں وہ یقین کر رہا ہے کیونکہ ابھی تک انہوں نے "حکومت کی لازمی خدمت" سے فرار ہونے کی بات قبول نہیں کی تھی ایسا وہ پہلی مرتبہ کر رہے تھے میرزا نے بڑی ذہانت سے کام لیا تھا وہ آگے بولے !

لیکن میں دھوکہ کھا گیا۔ وہ ایجنٹ دھوکے باز تھے ان پر اعتماد نہیں کرنا چاہئے تھا۔ چھ مہینے سے مجھے گھر والوں کی کوئی خبر نہیں ہے خدا جانے ان پر کیا گزر رہی ہو گی۔ کم از کم آپ لوگ انہیں مطلع کر دیں کہ میں یہاں قید ہوں

ان کو اطلاع دے دی گئی ہے۔

کیا میری ماں کو میرے یہاں ہونے کی خبر ہے ؟

تمہارے ماموں کو تو بتا دیا گیا تھا وہ اہواز میں تھے۔

پھر کچھ دیر چپ رہنے کے بعد وہ پھر بولا!

ہم جانتے ہیں کہ تم اب بھی جھوٹ بول رہے ہو لیکن گاڑی بیچنے کی بات تمہیں سچّا ثابت کررہی ہے۔

میرزا نے "آقا" سے ملاقات کاارادہ کر کے ایک گاڑی آٹھ ہزار تومان میں خریدی تھی اور اسی کے ذریعہ اہواز تک آئے تھے۔ کچھ دنوں تک حسین ماموں کے یہاں رکے پھر چار ہزار میں گاڑی بیچ کر سارا پیسہ ایک ایسے شخص کو دے دیا جسکا دعویٰ تھا کہ پاسپورٹ اور ویزے کے بغیر ہی وہ انہیں سرحد پار کرادے گا۔ لیکن وہ گرفتار کر لئے گئے اور اس وقت "ساواک" کے جیل میں پڑے تھے۔ پندرہ گھنٹے گذر چکے تھے نہ انہیں پانی ملا تھا نہ کھانا۔ بڑی کمزوری محسوس کر رہے تھے۔ اب انکی نگاہیں دروازے پر ٹکی تھیں۔ انہیں امید تھی کہ اس قدر ٹارچر کے بعد تو کچھ کھانے کو دے ہی دیں گے۔ انکااندازہ صحیح نکلا کچھ ہی دیر بعد ایک کانسٹبل ہاتھ میں کھانے کی ایک سینی لئے آیا اور ان کے سامنے رکھ کر جانا ہی چاہتا تھا کہ میرزا بولے!

صاحب!!!

کانسٹبل آنکھیں نکال کر ان کی طرف پلٹا۔ میرزا نے اپنے بندھے ہاتھوں کی طرف اشارہ کیا۔ کانسٹبل نے بغیر کسی توجہ کے باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد وہی قوی ہیکل ساواکی دوبارہ

داخل ہوا۔ میرزا اس سے التماس نہیں کرنا چاہتے تھے اور وہ بھی میرزا کے اس ارادہ کو بھانپ گیا تھا اسی لئے اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ جوان ابھی نیا نیا اسمگلنگ کے میدان میں وارد ہوا ہے۔ وہ کھڑا میرزا کو گھور رہا تھا اسی دوران ایک "اردلی" اندر داخل ہوا فوجی انداز میں سلام کر کے بولا!

باہر کوئی آپ سے ملنا چاہتا ہے۔

کون ہے کیا نام ہے؟

ایک خاتون ہیں جو کہہ رہی ہیں کہ میں محمد پدر درہ گرگی کی ماں ہوں۔

میرزا چونک پڑے ان کی ماں وہاں آ پہنچی۔ ان کو یقین نہیں ہو رہا تھا۔ ان کا اصلی نام محمد اور پدر درہ گرگی ان کا فیملی نام تھا۔ اور "میرزا" ان کا لقب۔ جس لقب سے ان کی ماں بچپن سے ان پکارتی تھیں۔ پھر سبھی انہیں "میرزا" ہی کہنے لگے تھے ساواکی نے میرزا کے بندھے ہاتھوں کو کھلنے کا اشارہ کیا، اور باہر چلا گیا

باہر دھوپ میں ایک خاتون دو مردوں کے ساتھ کھڑی تھیں۔ ساواکی نے پہچان لیا وہ میرزا کی ماں ہی تھیں۔ وہ واپس جانے کے لئے گھوما ہی تھا کہ میرزا کی ماں نے اسے آواز دی اور بولیں!

انسپکٹر صاحب ! کیا آپ وہی نہیں ہیں جو دو ماہ قبل گھر پر میرزا کو تلاش کرتے ہوئے آئے تھے ؟ !

ساواکی رک گیا اور مڑ کر خاتون کی طرف دیکھنے لگا۔ میرزا کی ماں پھر بولیں !

صاحب آپ کو خدا کا واسطہ مجھے اپنے بیٹے سے مل لینے دیجئے۔ میرا بیٹا میرزا یہیں ہے۔

یہاں اس نام کا کوئی آدمی نہیں ہے۔

محمد محمد پدر درہ گرگی جو "میرزا" کے نام سے معروف ہے۔

تم غلط آئی ہو اس نام کا شخص "اہواز" میں ہے۔

ہم لوگ کل اہواز گئے تھے۔ وہاں والوں نے ہی ہمیں یہاں بھیجا ہے۔

ساواکی نے خاتون کی کہی باتوں سے اندازہ لگا لیا کہ اہواز ہیڈ کوارٹر میں میرزا سے متعلق اسکی رپورٹ قبول کر لی گئی ہے۔ اب وہ اطمینان کے ساتھ ان کی ماں کو واضح جوب دے سکتا ہے وہ بولا !

تم لوگ تہران لوٹ جاؤ۔ چند دنوں بعد محمد کو تہران والوں کے حوالے کر دیا جائے گا اور انہیں دوبارہ "خدمت" پر مامور کر دیا جائے گا

سفرِ عراق

مارچ 1978 کے ایام تھے جب میرزا کو عراق جانے میں کامیابی حاصل ہوئی۔ شہر نجف میں داخل ہوئے تو آفتاب غروب کر چکا تھا۔ پورے شہر پر اندھیرے کی حکرانی تھی۔ چاروں طرف قبرستان جیسا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میرزا ایک بارونق شہر کا تصور لئے ہوئے آئے تھے لیکن اس بوجھل ماحول نے ان کے سفر کی تھکاوٹ کو مزید بڑھا دیا تھا۔مایوسی اور افسردگی کے ملے جلے تاثر نے ان کے ذہن میں کئی سوال ابھارے تھے! آخر یہ شہریوں افسردہ سا کیوں ہے؟ آقا برسوں سے اس شہر میں کیوں مقیم ہیں؟ اور نہ جانے کیا کیا خیالات میرزا کے ذہن میں ابھرے اور پھر نقش بر آب کی طرح مٹ گئے!

میرزا رات گزارنے کے لئے کسی مناسب ٹھکانے کی فکر میں تھے لیکن سب سے پہلے روضۂ امیر المومنین پر جانا تھا۔اس افسردہ خاطر ماحول میں دور سے ہی نظر آنے والا گنبد زریں ہی میرزا کو حوصلہ اور شوق دئے ہوئے تھا۔ میرزا حرم امام علی علیہ السلام میں پہنچے تو وہاں بھی سناٹا ہی تھا۔ صحنِ قبلہ کے ایک گوشہ میں چند افراد عبادت و مناجات میں مشغول تھے میرزا نے حوض پر وضو کیا، اندر داخل ہوئے ضریح پر نگاہ پڑتے ہی میرزا کو ضبط کا یارا نہ رہا دیر تک صرف روتے رہے۔ میرزا کے علاوہ ضریح کے اطراف میں چند افراد اور بھی مصروف مناجات تھے میرزا بھی ایک گوشے میں بیٹھ گئے نماز اور دعاؤں میں ایسا مشغول رہے کہ آدھی رات گذر گئی انہیں احساس نہ ہوا لیکن جب خادم حرم نے اشارہ

سے باہر نکلنے کی درخواست کی تاکہ وہ دروازے بند کر سکے تو میرزا اٹھے اور الٹے قدم حرم سے باہر آئے۔

حرم سے نکلتے وقت میرزا نے اشارے میں خادم سے رات گذارنے کے لئے کسی مناسب ٹھکانے کا پتہ دریافت کیا۔ خادم نے صورت سے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ ایرانی ہیں لہٰذا ایک ایسے مسافر خانہ کا پتہ بتایا جس کا مالک فارسی سے آشنا تھا اور اکثر ایرانی زائر وہیں قیام کرتے تھے چنانچہ میرزا کو وہاں ایرانی انداز کا کھانا بھی ملا۔

اگلی صبح میرزا نجف کی گلیوں میں ایک ایسے گھر کا پتہ پوچھ رہے تھے جس سے اکثر علماء اور طلاب دینی بخوبی آگاہ تھے لہٰذا جلد ہی میرزا اپنی منزل مقصود تک جا پہنچے۔ ان کے سامنے پرانی وضع کی ایک چھوٹی سی فرسودہ عمارت تھی۔ میرزا تعجب کئے بغیر نہ رہ سکے۔ آقا اتنے معمولی گھر میں رہتے ہیں؟ یہی بات ہے کہ آقا ہم جیسوں کا درد سمجھتے ہیں۔ میرزا نے چاروں طرف نگاہ ڈالی، باریک باریک گلیاں چھوٹے چھوٹے گھر جن میں معمولی طرز کے دروازے اور کھڑکیاں تھیں یہ محلہ "مولوی" محلہ سے کچھ کم شباہت نہیں رکھتا تھا۔ میرزا کچھ دیر یوں ہی گم سم دروازے پر کھڑے رہے پھر دقّ الباب کیا، دروازہ کھولنے والا ایرانی ہی تھا سلام وجواب کے بعد میرزا نے اپنا تعارف کرایا۔ وہ شخص میرزا کو اندر لے گیا یہاں ایک چھوٹا سا صحن تھا جس کے تین طرف کمرے بنے ہوئے تھے جن کی

ساخت کافی پرانی تھی کمروں میں لگے لکڑی کے بنے معمولی قسم کے کھڑکی دروازے بند تھے ابھی خنکی باقی تھی، ہلکی ہلکی نرم اور سرد ہوا چل رہی تھی میرزا ایک جانب کچّی اینٹوں کے بنے زینے پر بیٹھ گئے ٹھیک اسی وقت دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ دروازہ کھولنے والے نے میرزا کو اس کمرے میں چلنے کا اشارہ کیا۔ میرزا زینے طے کرتے ہوئے آدھے کھلے دروازے کے سامنے جا کھڑے ہوئے ان کے دل کی دھڑکن بڑھی ہوئی تھی آج وہ "آقا" سے ملاقات کرہی لیں گے ان کی برسوں کی آرزو پوری ہونے والی تھی: میرزا نے جوتے اتارے اور ایک لمبی سانس لے کر بسم اللہ کہا اور یااللہ کہتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ "آقا" ان کے سامنے موجود تھے جن کے نورانی چہرے پر اطمینان ہی اطمینان نظر آرہا تھا۔ سر پر سفید رنگ کی ٹوپی تھی۔ آقا نے سفید کرتے اور پائے جامے پر ایک سرمئی رنگ کا واسکٹ پہن رکھی تھی آقا نے اپنی لمبی اور خوبصورت سفید داڑھی کو کنگھی سے سنوار رکھا ہے۔ ایک گوشے میں طاق پر عمامہ رکھا تھا۔ میرزا کا دل چاہتا تھا کہ وہ یوں ہی کھڑے ہوئے گھنٹوں آقا کو بس دیکھتے رہیں۔ لیکن "آقا" آگے بڑھے اور بولے: خوش آمدید جوان۔ میرازا نے آگے بڑھ کر آقا کے ہاتھوں کا بوسہ لیا۔ ان کی آنکھوں سے عقیدت کے آنسو بہہ رہے تھے۔ آقا نے مسکراتے ہوئے میرزا کے سر پر ہاتھ پھیرا جس کا عجیب اثر میرزا کے دل پر پڑا جسے وہ کوئی معنی نہ پہنا سکے۔ میرزا نے اپنا سر آقا کے سینے پر رکھ دیا اور بے تحاشا رونے لگے۔ آقا نے انہیں اپنی آغوش میں لے لیا اور دیر تک سر پر ہاتھ پھیرتے رہے یہاں تک کہ

میرزا پر سکون ہوئے اور آقا سے ہٹ کر کھڑے ہوگئے۔ میرزا کو اپنی اس حالت پر شرمندگی کا احساس ہورہا تھا نہ جانے کیوں انہیں بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے کا دل چاہ رہا تھا۔ برسوں کے انتظار کے بعد "آقا" سے ملاقات نصیب ہوئی تھی۔ میرزا کی عجیب حالت ہورہی تھی۔

بیٹا تم تھکے ہوئے ہو؟

آپ سے ملاقات کے بعد ساری تھکاوٹ دور ہوگئی ہے۔

اچھی بات ہے بیٹھو۔

میرزا دو زانو ہو کر خاموش بیٹھ گئے۔ ایک بار پھر کمرے کا جائزہ لیا۔

یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں ایک دروازے کے علاوہ دو چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں نصب تھیں جن پر سفید رنگ کا پردہ پڑا تھا۔ ایک کونے میں کتابوں سے بھری الماری رکھی تھی۔ کچھ کتابیں دوسری طرف رکھی ہوئی میز پر بھی تھیں۔ زمین پر ایک ایرانی قالین بچھی ہوئی تھی۔

امام کی محبت آمیز نگاہ میرزا کے لئے بولنے کی اجازت بلکہ حکم کا عنوان تھی۔ میرزا مزید سنبھل کر بیٹھے۔ پھر نپے تلے الفاظ میں تمام روداد اختصار کے ساتھ بیان کرنے

لگے۔ جب بات اس خط تک پہونچی جس میں امام سے فوج پر حملہ کی اجازت مانگی گئی تھی تو امام نے کہا: آپ نے ابھی فوج کو نہیں پہچانا ہے۔ سارے فوجی ایک طرح کے نہیں ہیں۔ ہمیں سب کو ایک نگاہ سے نہیں دیکھنا چاہئے۔آپ کا مذکورہ منصوبہ پوری فوج کو شاہ کا حامی بنا دیتا اور شاہ کو ایک سنہرا موقع مل جاتا کہ وہ پوری فوج کو آپ لوگوں کے خلاف متحد کر سکے۔ فوج میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو پوری طرح اسلام اور قوم کے حامی ہیں۔ پھر امام نے سورۂ بقرہ کی ایک آیت پڑھی۔ میرزا کو اپنے سوال کا جواب مل چکا تھا۔ اگرچہ آقا کی بات کی پوری وضاحت میرزا کے لئے ایک سخت کام تھا لیکن یہ آیت سن کر میرزا کے دل میں امید کی کرن دوبارہ روشن ہو چکی تھی انہیں امید تھی کہ وہ واپس لوٹ کر ایک بار پھر توحیدی صف میں نئی جان ڈال سکیں گے۔ میرزا نے آگے بڑھ کر ایک بار پھر امام کے ہاتھوں کا بوسہ لیا۔ "امام" نے انہیں مزید باتیں کرنے کے لئے روک لیا اور ایران اور عوام کے متعلق مختلف سوالات کرنے لگے۔ میرزا کی حیرت کا ٹھکانہ نہ تھا امام عوام سے متعلق چھوٹے بڑے ایسے ایسے سوالات کر رہے تھے جن پر کبھی میرزا نے توجہ بھی نہ دی تھی اور ان امور کو اکثر لوگ اہمیت نہیں دیتے تھے۔

اذان ظہر تک میرزا امام کے ساتھ محو گفتگو رہے پھر امام کے پیچھے ظہرین ادا کرنے کے بعد رخصت ہوئے۔اب میرزا خود اپنے آپ میں بڑی تبدیلی محسوس کر رہے تھے اور اب وہ ملاقات سے پہلے والے میرزا نہ تھے۔ "آقا" کی باتوں نے ان کے اندر

انقلاب پیدا کر دیا تھا۔اب انہیں ناامیدی اور ذہنی کشمکش سے نجات مل چکی تھی لیکن میر زا کو ایک بات حیران کئے ہوئے تھی اور وہ "آقا" میں پایا جانے والا "اطمینان "آخر آقا نے اتنا یقین اور آسودہ خاطری کہاں سے حاصل کی۔ وہ سوچنے لگے کہ یہ بڑی نعمت کیسے حاصل کی جاسکتی ہے۔ وہ دل ہی دل میں دعا کرنے لگے خدایا! مجھے بھی یہ عظیم نعمت عنایت فرما۔ میر زاواپسی کے لئے سامان سفر باندھنے میں مشغول ہو گئے تھے، وہ محسوس کر رہے تھے گویا ان کا پورا وجود "آقا" کی محبت اور ان کی باتوں کی مٹھاس سے شیریں ہو چکا ہے۔ میر زا ایران لوٹ رہے تھے اور بعنوان تحفہ ایک نیا جوش و ولولہ اور گہری بصیرت اپنے ساتھ لئے جارہے تھے۔

شہید بہشتی کے ہمراہ

میر زا کا آیۃ اللہ بہشتی سے ملنا بہت ضروری تھا۔ حاج مہدی عراقی کو پیرس گئے کئی دن ہو چکے تھے لیکن میر زا کو اس سفر کی وجہ معلوم نہیں ہو سکی تھی۔ وزیر اعظم "بختیار" لوگوں کے انقلابی جوش کو دبانے میں ناکام تھا۔اس نے امام خمینی سے ملاقات کا وقت مانگا لیکن امام نے ملاقات کے لئے اس کے استعفے کی شرط رکھ دی۔ 'شاہ رضا روڈ' پر تل رکھنے کی جگہ نہ تھی۔ مظاہرین بختیار، بختیار، نوکر بے اختیار، کا نعرہ لگاتے ہوئے یونیورسٹی کے طرف بڑھ رہے تھے۔ شاہ ایران کے فرار کر جانے کی افواہ نے حکومت کی

جڑیں ہلا کر رکھ دی تھیں۔ میرزا بہت خوش تھے انکا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ اس بھیڑ سے جدا ہوں لیکن آقا بہشتی کے بلاوے نے ان کے قدم کو کورش کبیر روڈ پر موڑ دیا۔

بلند قامت، چوڑے شانے کے ساتھ سر پر سیاہ عمامہ رکھے وہ شخص میرزا کے سامنے کھڑا تھا۔ یہ پہلی بار نہیں تھا جب میرزا آقائی بہشتی سے ملاقات کر رہے تھے۔ تحریک انقلاب میں جتنا جوش وولولہ بڑھتا جارہا تھا اسی نسبت سے یہ ملاقاتیں بڑھ رہی تھی۔ میرزا ایک کونے میں بیٹھ گئے۔ آیۃ اللہ بہشتی کے ساتھ ایک اور عالم دین بیٹھے ہوئے تھے۔ میرزا نے انہیں امام باڑہ "حسینہ ارشاد" اور مسجد قبا میں دیکھا تھا۔ وہ کوئی اور نہیں آیۃ اللہ مطہری تھے۔ اسلامی علوم اور فلسفہ میں ان کے تبحر سے میرزا واقف تھے۔ آیۃ اللہ بہشتی بولے ! مجلس انقلاب نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ امام خمینی کے استقبال کے لئے ایک کمیٹی بنائی جائے۔ ایران میں داخلہ کے وقت امام کی حفاظت بھی اسی کی ذمہ داری ہو گی۔ امام خمینی نے یہ حتمی فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ ہر حال میں ایران لوٹیں گے۔ شاہ جلد ہی ایران چھوڑ دے گا۔ بختیار امریکی سفیر "سولیران" کے اشاروں پر کام کر رہا ہے اس کو استعفیٰ دینا ہی پڑے گا اور لوگوں کے سامنے آنا پڑے گا۔ ہم لوگوں کو بختیار پر گہری نظر رکھنی ہے۔ اور اگر لازم ہو تو اسکا صفایا بھی کرنا پڑیگا۔ آپ اس کام کے لئے کچھ لوگوں کو تیار کیجئے۔ تاکہ ضرورت پڑنے پر بختیار کو ٹھکانے لگایا جاسکے۔

میرزا سراپا گوش ہو رہے تھے وہ جانتے تھے کہ یہ احکامات مجلس انقلاب سے صادر ہو رہے ہیں اور اس وقت ان کے سامنے اس مجلس کے دو اہم رکن بیٹھے ہوئے ہیں۔ آیۃ اللہ مطہری نے میرزا کی طرف دیکھا اور کہا ! پیرس سے یہ پیش کش ہوئی ہے کہ امام خمینی کی حفاظت کی ذمہ داری "سازمان مجاہدین خلق" کے سپرد کی جائے۔ بعض لوگ یہ فکر

کرتے ہیں کہ یہ ایک منظم اور مسلح تنظیم ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں ہم لوگوں نے ابھی کوئی حتمی فیصلہ نہیں لیا ہے۔ ویسے مجاہدین خلق کی خدمت لینا بعید لگتا ہے۔ ان کا اصل مقصد اپنی تبلیغ کرانا ہے۔ وہ لوگ ان کاموں میں زیادہ دلچسپی نہیں لے رہے۔ میرزا بے اختیار بیچ میں ہی بول پڑے؛ان کا سابقہ بھی اچھا نہیں ہے۔ اپنی ظاہری شکل سے جو مقبولیت انہیں عوام الناس کے درمیان حاصل ہے ہمیں اس سے دھوکا نہیں کھانا چاہئے۔ ہم سب تو اچھی طرح آگاہ ہیں کہ وہ اندر سے کس قدر بداعمالیوں میں ملوث ہیں اور ساتھ ہی ساتھ انکی آپسی مشکلات بھی کچھ کم نہیں ہے۔

اس کمرے میں ان تین کے علاوہ حاج محسن بھی موجود تھے۔ان سے میرزا کی آشنائی حاج مہدی عراقی کے توسط سے ہوئی تھی۔ حاج محسن کا میرزا اور مجلس انقلاب کے اراکین کے ساتھ رابطہ حاج مہدی کے پیرس چلے جانے کے بعد سے بہت بڑھ گیا تھا۔ حاج محسن اس مسئلہ سے پہلے ہی واقف ہو چکے تھے انہوں نے بھی اس موضوع پر میرزا کے ساتھ گفتگو کی۔ وہ بھی اس ذمہ داری کو مجاہدین خلق کے سپرد کرنے کے مخالف تھے۔ وہ پہلے ہی میرزا سے کہہ چکے تھے کہ اگر ضرورت پڑی تو ان لوگون کے آپسی تنازعات، ان کی بداعمالیاں اور نظریاتی اختلاف کو عام کر دیا جائے گا۔ بعض لوگ اس تنظیم کے بارے میں حد سے زیادہ خوش فہمی میں مبتلا ہیں..........آیۃ اللہ طالقانی کئی برس سے جیل میں تھے وہ اس وقت کی سیاسی تنظیموں سے پوری طرح واقف نہیں ہیں۔ انکی جیل سے رہائی کو ابھی ایک ماہ پورے نہیں ہوئے ہیں۔اس عرصہ میں انکی ساری توجہ عوام اور امام خمینی پر مرکوز رہی ہے۔اس وقت انقلابی جوش و ولولہ نے بہتوں کو خوش فہمی میں مبتلا

کر دیا ہے۔ آیۃ اللہ بہشتی نے بڑے اطمینان سے ان جملات کو ادا کیا۔ پھر میرزا بولے ! لیکن ہم اس تنظیم سے روبرو ہو چکے ہیں اور انکی حقیقی تصویر ہمارے لئے عیاں ہے۔

کیا آپ کی نظر میں کوئی راہِ حل ہے ؟

آیۃ اللہ بہشتی کے اس سوال پر میرزا کچھ دیر سر جھکائے سوچتے رہے پھر بولے ! اًس سلسلہ میں سوچوں گا۔ دوستوں سے گفتگو کرنا بھی ضروری ہے۔

آیۃ اللہ مطہری نے میرزا کے محتاط جواب کو سنا اور ان پر ایک تحسین آمیز نگاہ ڈالتے ہوئے بولے ! ہم آپ کی رائے کا انتظار کریں گے۔ کیونکہ میں بھی بذاتِ خود مجاہدین خلق کے بارے میں آپ کے نظریہ سے متفق ہوں۔ یہ بات یاد رہے کہ جو تنظیم بھی آگے آئے وہ امام کی حفاظت کی ضمانت قطعی طور سے لے گی اور ہر ممکنہ حادثہ کی پوری ذمہ داری بھی اسی پر ہو گی۔ امام خمینی کی حفاظت سب سے اہم اور بڑا مسئلہ ہے۔ امام خمینی ایسے حالات میں ایران آرہے ہیں جب مسلح افواج اور ساواک کی باگ ڈور بختیار کے ہاتھوں میں ہے۔ وہ لوگ فوجی کاروائی بھی کر سکتے ہیں۔ ہم امام خمینی کی حفاظت کے متعلق کسی قسم کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ مجاہدین خلق کی پیش کش قبول کرنا خود ایک ایسا بڑا خطرہ ہے جو پورے انقلاب کو تباہ کر سکتا ہے۔ ان لوگوں نے مستقبل کے جو خواب دیکھ رکھے ہیں اس بارے میں میں بہت فکر مند ہوں۔ استاد مطہری چپ ہو کے کچھ سوچنے لگے۔ آیۃ اللہ بہشتی میرزا کی طرف متوجہ ہوئے اور بولے ! فی الحال آپ کے ذمہ دو کام ہیں۔ پہلا بختیار پر پوری نظر رکھنا اور اسے اسکے انجام تک پہنچانے کے لئے ضروری تیاریاں کرنا۔ دوسرا امام خمینی کے ورود ایران کے وقت انکی حفاظت کے لئے ایک منصوبہ بنانا۔ اگر کوئی مسئلہ در پیش آئے تو آپ ہم لوگوں سے ضرور بات کیجئے گا۔ میرزا جانے کے لئے اٹھے

آگے بڑھ کر آیۃ اللہ مطہری کی دست بوسی کی استاد مطہری نے انہیں سینے سے لگالیا۔ آیۃ اللہ بہشتی کے چہرہ پر ایک مسکراہٹ پھیل گئی۔

آج تحریک انقلاب جس منزل پر تھی وہاں ان لوگوں کی تشویش بہت بڑھی ہوئی تھی۔ آیۃ اللہ مطہری چاہ رہے تھے کہ زیادہ سے زیادہ مسائل میرزا کو سمجھا دیئے جائیں۔ میرزا انکی فکر مندی اور حالات کو اچھی طرح سمجھ رہے تھے انہیوں نے وہیں فیصلہ کیا کہ اپنے گروہ، توحیدی صف کے تمام ارا کین کو امریکی ایجنٹوں، ساواک اور فوج کے اعلیٰ افسران کی شدید نگرانی اور موقع ملنے پر انہیں انکے انجام تک پہچانے کے کام سے کچھ دنوں کیلیئے روک دیں گے اور انہیں حکم دیں گے کہ اپنی تمام توجہ امام خمینی کے حفاظتی انتظام پر مرکوز رکھیں۔ میرزا کی جنگ نے اب دوسرا رخ اختیار کر لیا تھا۔ اب وہ اپنی فوج کو مخفی گاہوں سے نکال کر منظر عام پر لا سکتے تھے۔ انہیں کھلے عام دشمنوں سے مقابلہ کرنا تھا۔ توحیدی صف کے ارا کین جنہوں نے سالوں سے ایک دوسرے کی شکل نہیں دیکھی تھی اب اکھٹا ہو کر کام کر سکتے تھے۔ اب میرزا کو خود اپنے گروہ کے تمام اعضاء بلکہ دوسرے گروہوں پر بھی اپنی حیثیت ظاہر کرنی تھی۔ خود توحیدی صف کے ممبران آج تک آگاہ نہ ہو سکے تھے کہ یہ گروہ کون چلا رہا ہے۔ میرزا ایک ایک رکن سے والہانہ محبت کرتے تھے۔ میرزا کی دلی تمنا تھی کہ ان تمام اعضاء کو نزدیک سے دیکھیں انہیں گلے لگائیں جو اسلام کے نام پر اپنی جان ہتھیلی پر لئے پھرتے ہیں۔ لیکن خود کو ظاہر نہ کرنے کی انکی حکمت عملی ارا کین کی حفاظت کے مد نظر تھی۔ اور یہی تدابیر باعث بنی کہ ساواک جیسا خطرناک اور خفیہ گروہ بھی توحیدی صف کے ارا کین کی نشاندہی نہ کر سکا۔ میرزا کا یہ نیا طرز عمل اور گروہ کو تنظیم دینا مولوی جیسی گھنی آبادی والے محلہ جہاں گھر بے ترتیبی سے

بنائے گئے تھے، میں انجام پایا جس نے ساواک کو بے دست و پا کر دیا تھا۔ گروہ، توحیدی صف ایک بہت پرانی اور گنجان آبادی سے تعلق رکھتا تھا اسی لئے وہ ساواک کی نگاہوں سے چھپا رہا۔ ساواک کبھی بھی پتہ نہ لگا سکی کہ اتنی زیادہ تعداد میں جو امریکی ایجنٹوں کا قتل ہوا ہے اسمیں کس کا ہاتھ ہے۔ آیۃ اللہ مطہری کے سینے سے لگے ہوئے میرزا نے تمام حالات پر ایک نگاہ ڈوڑائی۔ پھر ان لوگوں سے خداحافظی کرتے ہوئے کمرے سے نکل آئے لیکن ذہن امام خمینی کی حفاظت کے لئے پختہ لائحہ عمل بنانے کی دھن میں لگ گیا تھا۔

امام خمینی کی استقبالیہ کمیٹی

رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ "پاستور چوراہے" پر واقع پھولوں کی دکان کے مالک زعیم نے گھڑی کی جانب نگاہ کی وہ اب دکان بند کرنا چاہتا تھا۔ اسکا ارادہ بھانپ کر سعید دکان سے نکل پڑے اب وہ سڑک پر چہل قدمی کر رہے تھے۔ باستور چوراہے پر جسکے ایک جانب فوجی چھاؤنی اور دوسری جانب وزیر اعظم ہاؤس تھا، آمد رفت پر پابندی میں دو گھنٹے بچے تھے۔ رات دس بجے کے بعد سعید کا اس جگہ رکنا ان کے لئے مشکلیں کھڑی کر سکتا تھا۔ یہ دوسری رات تھی جب وہ سیاہ رنگ کی کار کا انتظار کر رہے تھے۔ اچانک موٹر سائیکل کی آواز نے جو مشرق کی جانب سے آرہی تھی انہیں چونکا دیا۔ کچھ لمحوں بعد ہی موٹر سائیکل چوراہے پر پہنچ گئی۔ اس کے پیچھے شورلٹ حرکت کر رہی تھی ڈرائیور کے بغل میں بیٹھے شخص نے کھڑکی کا شیشہ نیچے گرا رکھا تھا جس سے مشین گن کی

نال باہر جھانک رہی تھی۔ شورلٹ کے ٹھیک پیچھے سیاہ رنگ کی بنز تھی۔ سعید پھولوں کی دکان سے لگے کھڑے تھے۔ان کی نگاہیں دور تک اس قافلہ کا تعاقب کرتی رہیں۔ کئی مرحلوں میں بختیار کی آمدورفت کے راستوں کا پتہ لگاناتھا۔اس لئے ابھی ضروری نہیں تھا کہ وہ کسی وسیلہ کے ذریعہ اس قافلہ کا تعقب کرتے۔ بلیک کمانڈوز اپنے لباس سے پہچانے جارہے تھے۔ باشور چوراہے سے بنز مغرب کی جانب مڑ گئی۔

اگلی صبح سعید آذر بائیجان سڑک کے تراہے پر بختیار کے قافلہ کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ وہاں واقع مسجد کے دروازہ پر کھڑے تھے۔ نماز کا وقت قریب تھاوہ انتظار کرتے رہے یہاں تک کہ اذان کی آواز بلند ہوئی وہ نماز پڑھنے مسجد کے اندر چلے گئے اب نماز ختم ہوئے آدھا گھنٹہ گذر چکا تھا سعید بے چینی سے مغرب کی طرف بار بار دیکھ رہے تھے۔ تبھی موٹر سائیکلوں کی آواز سنائی دی وہ لوگ آذر بائیجان سڑک کے تراہے سے ہوتے ہوئے شاہ روڈ کی طرف مڑ گئے۔ سعید اپنے کام سے خوش تھے وہ منزل کے نزدیک پہنچ رہے تھے۔اگلے دن انہیوں نے بختیار کی گاڑی کو شاہ روڈ سے جمشیدیہ روڈ کی جانب جاتے دیکھا۔ وہاں سے آیز نہاور نامی چوراہے سے ہوتے ہوئے شہر کے شمالی علاقہ تک تعاقب کیا۔اگلے دن سعید الیزابیتھ کالونی کے اطراف میں ٹہل رہے تھے۔انہوں نے کچھ خشک میوے خرید رکھے تھے۔ وہ ٹہلتے رہے یہاں تک کہ موٹر سائیکلوں کا شور سنائی دینے لگا سیاہ رنگ کی نبزانہیں دور سے دکھائی دے رہی تھی۔ اس وقت سعید جہاں تھے وہاں سے تقریباً پچاس میٹر پر آریامہر روڈ کٹتی تھی۔ وہ بڑی تیزی سے اسی جانب بڑھے تاکہ مد نظر قافلہ کا اگلا راستہ معلوم کر سکیں لیکن قافلہ آریامہر روڈ پر جانے کے بجائے ٹھیک اسکے موڑ سے پہلے واقع فوجی (کیمپ) چھاؤنی میں داخل ہو گیا۔ فوجیوں نے احتراماً مخصوص سلام

کیا۔ سعید کافی دیر تک اس علاقے میں گھومتے پھرتے رہے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ اب کیا کریں۔ کیمپ میں ان کا داخلہ ممکن نہیں تھا۔ اب یہی صورت رہ گئی تھی کہ بختیار کے قتل کے لئے چھاؤنی سے باہر کسی مقام کا تعین کیا جائے۔ انہوں نے چھاؤنی کی پشت سے گزرنے والی سڑک جو شمال کی جانب جاتی ہے کے بارے میں سوچا۔ اور مزید اطلاع کے لئے اسی طرف چل پڑے۔ سڑک پر پہنچ کر انہوں نے دیکھا کہ چھاؤنی کے بائیں سمت کی چہار دیواری کافی بلند ہے اور دائیں طرف مکانات کا سلسلہ ہے۔ ان عمارتوں کے درمیان انکی نگاہ ایک ایسے مکان پر جا رکی جو ابھی نامکمل تھا۔ اور صاف ظاہر تھا کہ اسکا تعمیری کام رکا ہوا ہے۔ ساتھ ہی عمارت پوری طرح تاریک تھی۔ تو اسکا مطلب یہ ہوا کہ کوئی نگہباں بھی نہ ہو گا یہ سوچ کر سعید اُسی طرف چل پڑے۔ پورے مکان میں سناٹے کی حکمرانی تھی سعید اطمینان سے اسکی سب سے اوپری منزل پر چڑھتے چلے گئے۔ بائیں جانب والی چھت اس سے تھوڑا زیادہ اونچی تھی وہ اس پر پہونچ گئے اور ایک کولر کے پیچھے چھپ گئے۔ یہاں سے وہ پورے کیمپ پر اچھی طرح نگاہ رکھ سکتے تھے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ پوری رات وہیں رکیں گے۔ موسم سرما کی خشک ہوا ہڈیوں میں گھستی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے باوجود سعید نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ رات بھر اسی چھت پر رہ کر نگرانی کریں گے.. نماز صبح پڑھ چکنے کے بعد سعید نے اپنے کو پھر اسی کولر کی اوٹ میں کر لیا سپیدہ صبح پھیل رہی تھی۔ دن کی روشنی میں یہاں سے چھاؤنی کے ہر حصہ پر نگاہ رکھی جاسکتی تھی۔ سعید کو ایک جانب ردیف میں بنی چھوٹی چھوٹی رہائشی عمارتیں دکھائی دیں۔ سعید نے سوچا یقینا بختیار انہیں میں سے کسی ایک میں ہو گا۔ پھر ان عمارتوں میں سے باوردی فوجی نکلتے ہوئے دکھائی پڑے۔ سعید نہایت چوکسی سے دروازوں پر باری باری نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ تبھی انکی

نظر گرم کپڑوں میں ملبوس ایک آدمی پر پڑی جو صحن میں وارد ہوا تھا۔ وہ یقینا بختیار ہی تھا۔ دبلے پتلے اس آدمی کی عمر تقریباً پچاس کے آس پاس رہی ہوگی۔ سر کے سارے بال سفید ہو چکے تھے۔ اب وہ صحن میں ٹہل رہا تھا۔ اسکا بار بار جماہی لینا اس بات کی نشاندہی کر رہا تھا کہ وہ رات بھر صحیح سے نہیں سویا ہے۔ اس نے ہاتھ پیر کو ورزش کی نیت سے معمولی حرکتیں دیں اور پھر کمرے میں لوٹ گیا۔ سعید نے سوچا کہ یہاں سے تو وہ معمولی بندوق سے بھی نشانہ بنایا جاسکتا ہے۔ میرزا کو یہ جگہ دکھانی ضروری ہے۔ بختیار اب پوری طرح ہماری نظروں میں ہے یہ جان کر میرزا بہت خوش ہونگے۔........ سیاہ بنز آکر کھڑی ہوگئی۔ کچھ دیر بعد بختیار باہر نکلا۔ وہ گاڑی میں سوار ہو کر چل پڑا چند موٹر سائیکل اور ایک اسٹیشن کار اسکے آگے حرکت کر رہی تھی۔

سعید وہاں سے تیر کی طرح سیدھے میرزا سے ملاقات کو چل پڑے۔ اضطراری حالت میں ملاقات کی معینہ جگہ پر میرزا موجود تھے یہاں صرف مخصوص مہم پر کام کر رہے لوگ ہی ضرورت پڑنے پر میرزا سے مل سکتے تھے۔ سعید نے انہیں تفصیلی صورت حال سے آگاہ کیا۔ میرزا بولے ! مرکز کی چھاؤنی، آخر کیوں؟ تہران میں اس سے بہتر اور اہم چھاؤنیاں موجود ہیں۔ شاید حفاظتی نقطۂ نظر سے وہ وہاں دوسروں کی نگاہ سے پوشیدہ رہ سکتا ہے اسکی وہاں موجودگی کی طرف شاید ہی کسی کا دھیان جائے۔ لیکن ایک منٹ ٹھہرو تم نے کیا کہا تھا؟ وہ جماہی لے رہا تھا۔ اسکا مطلب ہوا وہ دیر رات تک جاگتا رہا تھا۔ اس صورت میں یقیناوہ کسی اہم میٹنگ میں شریک رہا ہوگا۔ لیکن یہ میٹنگ کن لوگوں کے ساتھ تھی؟ مرکز کی چھاؤنی میں تو اعلیٰ افسران نہیں رہتے۔ وہ تو فوجی جیل کے عنوان سے زیادہ استعمال ہوتی ہے۔ کیا تمہیں شریف امامی کا سیاسی کھیل یاد نہیں؟ جب وہ

وزیر اعظم تھا تو حکومت مخالف تحریک کو کچلنے کے لئے اس نے کیا کیا نہیں کیا۔ اسی زمانے میں اس نے کچھ حکومتی عہدہ داروں جیسے ساواک کا رئیس نصیری اور ہویدا اور اسی طرح کے کئی افراد کو گرفتار کرواکر اسی چھاؤنی میں قید کروایا تھا.........وہ لوگ ابھی بھی اسی جگہ ہیں۔ ظاہراً حکومت کے قیدی ہیں لیکن پس پردہ وہ بختیار کے مشاورین کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لہٰذا یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ یہ چھاؤنی سازشوں کا اڈا ہے۔ تم ایک لمحہ بھی اس جگہ کی نگرانی سے غافل نہ ہونا۔ اگر ضرورت پڑی تو میں بختیار کے قتل کا حکم حاصل کر لوں گا۔ اگر وہ اپنا ٹھاکانہ بدل دے تو فوراً مطلع کرنا۔

میرزا تیزی سے امام خمینی استقبال کمیٹی کے دفتر کی جانب جارہے تھے۔ مسجد سپہ سالار سے گزرنے والی سڑک پر جس کی ایک جانب "مجلس شوریٰ ملی" کی عمارت واقع تھی بڑا ازدہام تھا۔ میرزا وہاں سے گزرتے ہوئے سیدھے اسکول رفاہ کی طرف چل پڑے۔ اسکول کے سامنے سفید کپڑے پر جلی حروف میں لکھا ہوا تھا "امامِ خمینی استقبال کمیٹی" میرزا جب بھی اس اسکول میں داخل ہوتے تھے ان کی نگاہ وہاں دیوار پر منقوش اس مصرعہ پر ضرور پڑتی جو ملک کے موجودہ حالات کی بھرپور ترجمانی کرتا تھا۔

دیو چو بیرون رود فرشتہ در آید

چند افراد صحن کی صفائی میں مشغول تھے کلاس روم کی میز کرسیاں ایک کنارے پر اکٹھا رکھ دی گئیں تھیں۔ ان کی جگہ فرش بچھایا جارہا تھا۔ حاج محسن نے میرزا کو دیکھتے ہی کہا! کہاں غائب ہو؟ میرزا نے جیب سے چند اوراق نکالے اور بولے! یہ وہ منصوبہ ہے جو آیۃ اللہ بہشتی نے ہم سے مانگا تھا۔ مصطفےٰ نے اس پر بہت کام کیا ہے۔ ہم نے ہوائی اڈے کو اچھی طرح دیکھ لیا اور اسکا نقشہ اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔ ورود و خروج کے سبھی ممکنہ راستے

پر ہماری نظر ہے۔ حاج محسن میرزا کو ایک کمرے میں لے گئے۔ حاج محسن نے وہ کاغذات میرزا سے لے کر ان پر ایک سرسری نگاہ ڈالی اور بولے۔ بختیار "جبہہ ملی" کا پرانا رکن ہے۔ ہمیں نے اس کے کچھ قدیمی دوستوں کو آمادہ کیا ہے کہ وہ اس سے گفتگو کریں۔ ہم چاہتے ہیں کہ پلیٹ فارم شمارہ ایک پر جانے والی گذرگاہ جس کی ابھی مرمت ہوئی ہے اور ابھی تک بروئے کار نہیں لائی گئی ہے۔ پوری طرح ہمارے اختیار میں دے دی جائے۔ ہماری پوری توجہ صرف پہلے پلیٹ فارم پر ہی ہے یہ ہوائی پٹی سے نزدیک بھی ہے اور سب سے چھوٹا بھی جس کے سبب یہاں حفاظتی انتظام کرنا بہتر اور آسان ہے۔ اور اگر ملک کے حالات ایسے ہی چلتے رہے تو یہ ہمارے حق میں بہتر ہے۔ امام خمینی کی واپسی سے بختیار کا مخالفت کرنا لوگوں کے جوش و خروش کے دوبالا ہونے کا سبب بنا ہے۔ مظاہرین کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے جس نے حکومت کو چکرا دیا ہے۔ اگر وہ امام کے لئے ہوائی اڈا بند نہ کرتے تو شاید ہمارے لئے ایسے بہتر حالات نہ پیدا ہو پاتے۔ لیکن اب تو حالات پر ہماری پکڑ بہت مضبوط ہو گئی ہے۔ آپ اس بات پر اصرار کیجئے کہ ہوائی پٹی پوری طرح ہمارے قبضہ میں دے دی جائے۔ کوئی بھی مسلح آدمی اس احاطہ میں داخل نہیں ہو سکتا۔ مخالفت کی صورت میں ہمارے آدمی بے دریغ فائر کر سکتے ہیں۔

ہم کئی مرحلوں میں بختیار سے اپنے مطالبے پورے کروائں گے اور یہ کام اس کے انہیں قدیمی دوستوں کے ذریعہ لیا جائے گا۔ بختیار ساری باتیں شاہ کے قریبی لوگوں کے درمیان رکھے گا پھر کوئی فیصلہ کرے گا۔ اس کا ٹھکانہ مرکز کی چھاؤنی میں ہے ہم اسی بات سے پہلے ہی باخبر ہو چکے ہیں۔ یااللہ کی ایک آواز آئی وہ لوگ کھڑے ہو گئے آیۃ اللہ بہشتی بہت جلدی میں دکھ رہے تھے کمرے میں داخل ہوئے علیک سلیک کے بعد بیٹھتے

ہی بولے! ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ شہباد چوراہے اور ہوائی اڈے کے اطراف میں مظاہرین کی کثیر تعداد اور ان کے پر جوش اعتراضات نے بختیار کو ہماری باتیں قبول کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اب ہوائی اڈے کا ایک حصہ پوری طرح ہمارے قبضہ میں ہے۔ اس کے باوجود کسی بھی قسم کی سازش کے امکانات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ امام خمینی ہر قیمت پر ایران واپس آنے پر مصر ہیں۔ اگر ہماری پیش بینیاں درست ثابت ہوئیں تو انشاء اللہ کوئی مشکل پیش نہ آئے گی۔

میرزا نے حفاظتی انتظام کے منصوبہ کی تفصیلات ان کے سامنے رکھ دیں۔ اور کہا! یہ وہ پروگرام ہے جو آپ نے چاہا تھا اس کے مطابق حفاظت کا کام بخوبی انجام دیا جا سکتا ہے۔ آقا مصطفی کہاں ہیں آیۃ اللہ بہشتی نے پوچھا؟ وہ آنے والے ہوں گے۔ وہ ہوائی اڈے کے تازہ حالات کا نزدیکی سے جائزہ لینے گئے ہیں۔ ہم لوگوں نے آقا مصطفی اور اکبر آقا کی مدد سے اس لائحہ عمل پر ہر جانب سے نگاہ کی ہے اور اس کے تمام گوشے اچھی طرح اراکین کے ذہن نشین کروائے گئے ہیں۔

آج مجلس انقلاب کا جلسہ ہے جس میں آخری فیصلہ لیا جائے گا، مجاہدین خلق کے سربرآوردہ اشخاص ابھی تک زور دئے ہوئے ہیں کہ امام کی حفاظت کی ذمہ داری انہیں کے سپرد کی جائے...... میرزا نے آیۃ اللہ بہشتی کے چہرہ پر نگاہ کی اور کہا! میں ان لوگوں کی پیش کش کے بارے میں نہیں جانتا اور نہ ہی مجھے ان کے لائحہ عمل کے بارے میں کسی قسم کی اطلاع ہے۔ بہر حال اگر ہم لوگ جلسہ میں نہ ہوئے تو ہماری پیشنہادوں کو ہماری طرف سے آپ پیش کر دیجئے گا۔ پھر میرزا نے ایک کاغذ آیۃ اللہ بہشتی کو دیا جسے انہوں نے فوراً ہی پڑھ ڈالا وہ چند سطریں ہی تھیں لیکن ان کے پڑھنے کے بعد آیۃ اللہ بہشتی

کے چہرہ پر ایک اطمینان کا رنگ نمودار ہو گیا تھا۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے ایک نگاہ میرزا پر ڈالی جو سر جھکائے بیٹھے تھے۔ ٹھیک اسی وقت مصطفی داخل ہوئے اور آیۃ اللہ بہشتی بولے! آپ لوگ یہیں رکے رہیئگا شاید کوئی مسئلہ درپیش آئے۔

یہاں سے نکل کر آیۃ اللہ بہشتی ایک بڑے کمرے کی طرف جانے لگے جس کے دروازے پر تقریباً بیس جوڑے جوتے رکھے ہوئے تھے۔ میرزا اٹھ کر ٹہلنے لگے۔ "شورائے انقلاب" کے اراکین اور دوسری برجستہ شخصیت جلسہ میں شرکت کے لئے آچکی تھیں ان معروف افراد کے علاوہ کچھ ایسے لوگ اور بھی آئے تھے جنہیں میرزا پہلی بار دیکھ رہے تھے۔

"شورای انقلاب" کی میٹنگ شروع ہو چکی تھی آیۃ اللہ مطہری، آیۃ اللہ بہشتی اور آیۃ اللہ مفتح ایک ساتھ بیٹھے تھے۔ "سازمان مجاہدین" کے بنیادی ارکان میں سے آیۃ اللہ طالقانی اور انجینئر بازرگان بھی موجود تھے۔ سازمان کا موجودہ صدر مسعود رجوی ایک کنارے بیٹھا نہ جانے کیوں بار بار آیۃ اللہ بہشتی کی طرف دیکھتا۔ "مہدی ابریشم چی" اور "موسیٰ چنابان" بھی جو ابھی جلدی ہی جیل سے آزاد ہوئے تھے جلسہ میں شریک تھے۔ ڈاکٹر باہنر بھی دیوار سے ٹیک لگائے موجود تھے۔ آیت اللہ مطہری نے سب سے پہلے قرآن کی ایک آیت پڑھی پھر اصل موضوع کو پیش کیا۔ آج کی میٹنگ میں زیر بحث مسئلہ یہ تھا کہ "امام" کی حفاظت کے لئے کس کمیٹی کو ذمہ دار بنایا جائے۔ چنانچہ اس مسئلہ کو طے کرنے کے لیے

امام خمینی نے شورای انقلاب کو یہ ذمہ داری سونپی تھی۔ آیۃ اللہ مطہری نے حاضرین پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا!

ہمارے پاس دو پیش کش آئی ہے۔ دونوں آپ حضرات کے سامنے پیش کی جائے گی۔

پھر 'رجوی' کی طرف دیکھ کر بولے!

ہم لوگ آج کا منصوبہ سننے کے لئے آمادہ ہیں۔

رجوی بولا! ہم لوگ کتبی ضمانت دینے کے لئے تیار ہیں کہ امام کو کوئی گزند نہ پہنچے گا۔ ہم اپنی تمام طاقت لگادیں گے۔ پھر موسیٰ خیابان کی طرف اشارہ کر کے بولا !

" خیابانی صاحب" ہماری مسلح ٹیم کے سربراہ ہیں یہ تفصیل سے بتائیں گے کہ ہمارا کیا پروگرام ہے۔

موسیٰ خیابان نے بولنا شرع کیا!

اگر آپ لوگ ہمیں اسلحہ مہیا کریں تو ہم ڈیڑھ سو آدمیوں کو مسلح کر دیں گے۔ اور امام کے آنے کے تمام راستوں کی پوری طرح ناکہ بندی کر دیں گے۔ اور ساتھ ہی کسی اور کو ہمارے انتظامات میں دخل اندازی کا حق ہر گز نہ ہو گا۔ ہم سب سے پہلے پورے ایئرپورٹ

پر قبضہ کریں گے۔اور ہوائی جہاز کی سیڑھیوں سے امام کی حفاظت کی ذمہ داری لینے کو تیار ہیں۔اوراس دن کے تمام پروگراموں میں آخرتک موجود رہیں گے۔

آیۃاللہ مطہری نے "رجوی" سے پوچھا!

آپ کی کوئی اور شرط؟

ہمارے پاس چند عدد بندوق اور کچھ ریوالور ہیں۔ "تقی شہرام" کی خیانت سے ہمارے تمام اسلحے "ساواک والوں" نے ضبط کر لئے ہیں۔اسلحہ کی مانگ کے علاوہ ہماری دو شرط اور ہے۔ پہلی یہ کہ ابتدا سے لے کر آخری پروگرام کے اختتام تک میرے علاوہ کوئی اور "آیۃ اللہ خمینی" کے ساتھ نہ ہوگا۔ اور دوسری شرط یہ ہے کہ معینہ راستے ہیں ہم کچھ مکانات کی نشاندہی کریں گے جن کی چھتوں پر ہمارے مسلح آدمی موجود ہوں گے اور ہمیں اختیار ہوگا کہ ہم ان تمام مکانات پر "سازمان مجاہدین" کا مخصوص نشان والا پرچم اور سازمان کے شہیدوں کی تصویریں نصب کریں گے۔

آیۃاللہ مطہری نے آیۃاللہ بہشتی کی جانب دیکھااور بولے!

آپ اپنے منصوبہ کو بیان کریں۔

آیۃاللہ بہشتی نے میرزا کا دیاہوا کاغذ اپنی جیب سے نکالااور بولے!

آپ لوگوں نے "گروہ توحیدی صف" کا نام تو سنا ہی ہے۔ یہ گروہ پچھلے دو سال سے متعدد مہمات انجام دیتا رہا ہے۔ ابھی حال ہی میں امریکی ایجنٹوں سے بھری بس کو دھماکے سے اڑانے والے اسی گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان لوگوں نے بڑے پیمانے پر فوجی ٹریننگ لے رکھی ہے۔ اور متعدد کامیاب مسلحانہ مہم کامیابی کے ساتھ انجام دے چکے ہیں۔

ان لوگوں نے اپنے منصوبے میں باریک سے باریک باتوں پر نگاہ رکھی ہے۔ یہاں تک کہ ہوائی جہاز کس رخ سے زمین پر اترے تاکہ راڈر کے بلند عمارت سے کوئی گولی کا نشانہ نہ بنایا جاسکے۔ ان لوگوں کو یقین نہیں ہے کہ ایئرپورٹ کے اندر آسانی سے اسلحے لے جا سکیں گے۔ لٰہذا انہوں نے اسلحہ اندر لے جانے کے لئے الگ منصوبہ بنایا ہے جس کے لئے مخصوص افراد بھی طے کر رکھے ہیں۔ ان لوگوں نے دس عدد بلٹ پروف گاڑیاں مد نظر رکھی ہیں۔ ضرورت پڑنے پر وہ لوگ چار ہزار افراد کو مسلح کر سکتے ہیں۔ اسلحے مہیا کرنا بھی خود ان کی ذمہ داری ہو گی۔ مجھے نہیں معلوم اتنی مقدار میں اسلحے کہاں سے مہیا کریں گے لیکن مجھے ان کے سربراہ پر پورا بھروسہ ہے۔ ایک غیر معروف جوان ہے لیکن اسنے بارہا اپنی غیر معمولی صلاحیت ثابت کی ہے۔

آیۃاللہ طالقانی بولے!

ایک انجانے شخص پر کیسے بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔سازمان مجاہدین کتبی ضمانت دینے کو تیار ہے۔اور ساتھ ہی یہ "سازمان" ایک تجربہ کار اور جانی پہچانی تنظیم ہے۔

آیۃ اللہ طالقانی نے پوچھا ان کی کیا شرائط ہیں۔آیۃ اللہ بہشتی ایک لمحہ خاموش رہے۔انہیں میرزا کا چہرہ یاد آرہا تھا جب میرزا انہیں یہ کاغذ دے رہے تھے تو ان کے چہرے پر جوش و خروش اور خود اعتمادی کے آثار نمایاں تھے آیۃ اللہ بہشتی بولے!

سازمان مجاہدین کے بر خلاف ان کی صرف ایک شرط ہے۔آیۃ اللہ بہشتی نے بلند آواز کے ساتھ میرزا کی شرط پڑھنا شروع کردی ہماری صرف ایک شرط یہ ہے کہ کسی کو معلوم نہ ہو اس پُر افتخار ذمہ داری کو ہم ادا کر رہے ہیں۔ہم پہلے کی طرح غیر معروف رہنا چاہتے ہیں۔

آیۃ اللہ طالقانی یہ سن کر کھڑے ہوگئے اور بولے !

میں ان لوگوں سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔

باہر موجود ہیں آقائی بہشتی بولے!

پھر آیۃ اللہ بہشتی آیت اللہ طالقانی کو لے کر باہر نکلے۔میرزا اور مصطفےٰ صحن میں ٹہل رہے تھے۔ان حضرات کو دیکھ کر وہ دونوں رک گئے۔آیۃ اللہ طالقانی ان دونوں کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے دو چہرے بالکل الگ الگ قسم کے ایک جنگجو لگ رہا تھا اور دوسرے کے

چہرے کی معصومیت ہر دیکھنے والوں کو جذب کر لینے کی صلاحیت رکھی تھی۔ آیت اللہ بہشتی آیۃ اللہ طلا قانی کے کان میں مصطفیٰ کے تجربوں اور میرزا کی ذہانت کے بارے میں بتانے لگے۔ آیۃ اللہ طالقانی تیزی کے ساتھ کمرے میں لوٹے۔

مصطفیٰ کی بے چینی میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ میرزا نے انہیں پریشان دیکھا تو بولے!

کیوں پریشان ہو۔ ہم کو ہر حال میں اپنا وظیفہ انجام دینا ہے اگر یہ ذمہ داری ہمارے حوالے کی گئی تو ہر قیمت پر اسے پوری طرح نبھائیں گے۔ خدا پر توکل کرو سب کچھ اسی کے ہاتھ میں ہے۔

ایک بار پھر آیۃ اللہ بہشتی باہر آئے میرزا اور مصطفیٰ کو ایک گوشے میں لے جا کر بولے!

مسئلہ انقلاب کی حیثیت کا بھی ہے۔ ہماری شرط کے متعلق وہ لوگ تردید کے شکار ہیں۔ سازمان مجاہدین شہرت چاہتے ہیں۔ ایسی صورت میں "امام" کو ان کا احسان مند ہونا پڑے گا۔ وہ لوگ ہر طرح کی ضمانت دینے کو تیار ہیں۔

آیۃ اللہ بہشتی کچھ دیر کے بعد پھر بولے!

آپ لوگ اپنے منصوبے پر کتنا یقین رکھتے ہیں۔ یہ چار ہزار افراد کہاں سے لائیں گے؟ آپکے مخصوص آدمی کس طرح ایئرپورٹ میں داخل ہوں گے؟ چھوٹی میزائیل پھینکنے کی

مشین، اتنی تعداد میں آر۔ پی۔جی کہاں سے مہیا کریں گے ؟اور ٹینکوں کی موجودگی میں یہ سب کس طرح ایئرپورٹ تک پہونچے گا؟ میری خود سمجھ میں نہیں آرہاہے محمد! اندر بیٹھے لوگوں کوان سوالات کا جواب چاہئے ؟ مجھے اتمام حجت کے لئے بھیجا گیاہے۔

میرزاجو خاموشی کے ساتھ بڑے غور سے آیۃاللہ بہشتی کی باتیں سن رہے تھے بولے !

ہم کو موقع دیجئے ہم خود انہیں اپنے منصوبے سے تفصیل کے ساتھ آگاہ کریں۔ زیادہ تر اسلحے مہیا کئے جاچکے ہیں۔

آیۃاللہ بہشتی کو کچھ اطمینان حاصل ہوا"میرزا" کے یقین اوراعتماد نے انہیں سہارادیا تھاوہ واپس میٹنگ روم میں چلے گئے۔

یہ لوگ بھی امام کی حفاظت کی ضمانت دینے پر آمادہ ہیں۔ ساتھ ہی ان کی کوئی شرط بھی نہیں ہے۔اور تمام انتظامات خود ہی انجام دینے پر آمادہ ہیں۔ایسی صورت میں ہم یہ ذمہ داری "سازمان مجاہدین" کے سپرد نہیں کرسکتے۔

آیۃاللہ طالقانی نے رجوی کی طرف دیکھا انہیں "سازمان مجاہدین" کی اس کمزوری کی امید نہ تھی۔ بہرحال ان کے سامنے بھی سب سے بڑا مسئلہ "امام" کی حفاظت کا تھا۔

کچھ دیر کے لئے خاموشی چھاگئی تھی۔ آیۃ اللہ مطہری نے باری باری موجود لوگوں کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ ڈاکٹر مفتح اور باہنر کے چہرے سے عیاں تھا کہ وہ آیۃ اللہ بہشتی کی پیش کش سے راضی ہیں۔ انجینئر باررگان خود کو غیر جانب دار ہی ظاہر کر رہا تھا۔ آیۃ اللہ شہید مطہری کھڑے ہوئے تاکہ موجودین کو وداع کہہ سکیں۔ سب سے پہلے آیۃ اللہ طالقانی کمرے سے باہر نکلے۔ ان کی نگاہیں ایک بار پھر میرزا اور مصطفےٰ پر پڑیں۔ وہ اب بھی ان دونوں جوانوں کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں کر سکے تھے۔ میرزا اور مصطفےٰ احتراماً سینے پر ہاتھ رکھ کے ذرا سا جھکے پھر میرزا نے مسعود رجوی، مہدی ابریشم جی، اور موسیٰ خیابان کو دیکھا سب بغیر میرزا کو پہچانے ان کے سامنے سے گزرتے ہوئے مدرسہ سے نکل گئے۔ ان لوگوں کی چڑھی ہوئی بھویں میرزا کے لئے خوشی کا پیغام تھیں۔ یعنی امام کی حفاظت کی ذمہ داری میرزا کے حوالے کر دی گئی ہے۔ آیۃ اللہ بہشتی کمرے سے مسکراتے ہوئے باہر نکلے اور آگے بڑھ کر میرزا اور مصطفےٰ کو گلے سے لگالیا۔

محمد صاحب آپ کی فتح ہوئی۔

ہم عہد کرتے ہیں کہ قوم کی آنکھوں کے تارے کو صحیح وسالم قوم کے حوالے کریں گے۔

فیصلہ کا دن

اگلے دن کے اخبار چیخ رہے تھے، "چار ہزار مسلح افراد امام کی حفاظت کریں گے" یہ معلوم نہ ہو سکا کہ مطبوعات تک یہ خبر کس کے توسط سے پہونچی لیکن اس خبر کا پھیلنا بہت مؤثر اور مفید ثابت ہوا۔ مصطفی اور اکبر تہران کے کئی محلوں میں ایک بڑی تعداد کی تربیت کر رہے تھے۔ مد نظر لائحہ عمل کو عملی جامہ پہنانے کے لئے دن رات محنت کی جا رہی تھی۔

میرزا نے توحیدی صف کے اکثر راکین کو اسکول رفاہ بلوالیا تھا اور سب کو کچھ نہ کچھ ذمہ داری سونپ دی گئی تھی۔ حمید اور بیک زادہ دوسروں کی بہ نسبت زیادہ خوش نظر آرہے تھے۔ دستی بم بنانے والے کارکانہ کو بند کئے جانے سے وہ بہت خوش ہوئے کیوں کہ ابھی تک میرزا کے حکم کے مطابق انہیں مظاہروں میں بھی شریک ہونے کی اجازت نہ تھی۔ اور آج وہ امام کے دیدار اور استقبال کے لئے آمادہ ہو رہے تھے۔ وہ امام خمینی کو نزدیک سے دیکھیں گے یہ سوچ کر ہی وہ خوشی کے مارے پھولے نہ سماتے تھے۔ احمد، حسن، رحمت، امیر اور استاد ابراہیم نے دن رات ایک کر رکھی تھی۔ شقاقی، سید جلال اور علی کی کمی جو جیل میں تھے سب کو کھل رہی تھی۔ سلمان اصفہان سے آئے تھے اور محسن کے ساتھ مل کر ایک اہم کام کی تیاری کر رہے تھے۔ ان کا کام امام کے آنے کے دن اسلحو ں کو ہوائی اڈے کے مسافر خانہ تک پہونچانے کا تھا۔ جعفر اور شکوری ابھی ابھی آئے تھے وہ میرزا سے ملنا چاہ رہے تھے اور میرزا کو ایک لمحہ نہ چین تھا نہ آرام کی فرصت۔

2 جنوری 1979 کی صبح چار عدد نبز کار تین عدد بی ایم کار اور ایک بلیزر شہیاد چوراہے پر نمودار ہوئیں۔ لوگوں کی بھیڑ صبح سے ہی وہاں امڈی چلی آرہی تھی۔ کسی گاڑی کا وہاں سے گذرنا ممکن نہ تھا۔ لیکن گاڑیوں کے اس قافلے کے لئے راستہ چھوڑ دیا گیا۔ امام خمینی استقبال کمیٹی کا مخصوص اجازت نامہ دکھائے بغیر اسے بھی عبور کی اجازت نہیں ملی تھی۔ میرزا 20 مسلح افراد کے ساتھ گاڑی میں بیٹھے تھے۔ گاڑی کے عقبی حصہ میں اچھی خاصی تعداد میں چھوٹی ساخت کے راکٹ لانچر، آر۔ پی۔ جی، دو مشین گن اور بہت سارے کلاشنکوف رکھے ہوئے تھے۔ میرزا کا اندیشہ تھا کہ ہوائی اڈے کی طرف جانے والی سڑک کے دونوں جانب جو لوگ قطار بند کھڑے ہوئے ہیں امام کے باہر آنے پر کچھ گڑبڑی مچا سکتے ہیں۔ گاڑی میں موجود راکٹ لانچر جس کے بارے میں کوئی نہیں بتا سکتا تھا کہ کہاں سے مہیا کئے گئے ہیں۔ یہ ٹینکوں کے مقابلہ کے لئے تھے۔ ٹینکوں پر موجود فوجی حیرت سے اس قافلہ کو دیکھ رہے تھے۔ ہوائی اڈا جانے والی سڑک کے ایک طرف آذر بائیجان سے آئے ہوئے لوگوں نے سات دنوں سے قبضہ جمار کھا تھا۔ امام خمینی کے خیر مقدم کو آئے ہوئے ان لوگوں نے فٹ پاتھ پر کمبل بچھا رکھے تھے۔ یہ لوگ روزآنہ استعمال ہونے والے گھریلو وسائل بھی اپنے ہمراہ لائے تھے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ یہ گاڑیاں امام کو لانے جارہی ہیں تو انہوں نے اپنے ہاتھ ہلا کر انکا استقبال کیا ہر شخص کا پر امید چہرہ گویا ان سے کہہ رہا ہو کہ تم اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہوگے۔

پانچویں بہمن کو امام خمینی کو ایران نہ آنے دینا باعث بنا کہ لوگ دوسرے صوبوں سے بھی اعتراضاً تہران پہنچ گئے۔ شہیاد چوراہے اور ہوائی اڈے کے علاقے میں امڈی اس بھیڑ نے کئی دنوں سے دھرنا دے رکھا تھا۔ آج ایک ہفتہ بعد ان کے چہروں پر

امید کی کرن نے تازگی بکھیر دی تھی۔ ہوائی اڈے کی جدید عمارت کے سامنے بڑا شور و غوغا تھا۔ یہاں امام خمینی استقبال کمیٹی کے مسلح افراد اچھی خاصی تعداد میں صرف بھیڑ کو قابو میں رکھنے کے لئے تعین کئے گئے تھے۔ وہ ہوائی اڈے کے ویٹنگ روم میں صرف ان لوگوں کو داخل ہونے دے رہے تھے جن کے پاس مخصوص اجازت نامہ موجود ہوتا۔ گاڑیوں کا قافلہ جوں ہی ہوائی اڈے پہونچا وہاں موجود انتظامی امور کے گارڈوں نے اس قافلے کے لئے بھیڑ کو ایک طرف کرکے راستہ ہموار کیا۔

میرزا نے محسن اور سلمان کو اشارہ کیا کہ وہ اسلحوں کو اندر تک پہونچانے کا کام شروع کردیں۔ وہ دونوں عبا، قبا اور عمامہ میں ملبوس تھے۔ دونوں نے لمبی قبا دوش پر ڈال رکھی تھی اور اسی میں چار چار کلاشنکوف چھپا رکھے تھے۔ وہ نہایت اطمینان سے دھیرے دھیرے اندر کی جانب چل پڑے میرزا ٹھیک ان کے آگے چل رہے تھے۔ وہ ایسا ظاہر کر رہے تھے گویا وہ دونوں بہت اہم شخصیتیں ہیں۔ وہ لوگ میرزا کے پیچھے پیچھے اندر داخل ہوگئے۔ تفتیش کے لئے وہاں تعینات فوجی ان کی ظاہری ہیبت اور میرزا کے تظاہر سے مرعوب ہوگئے اور جامہ تلاشی کے بغیر ہی انہیں اندر جانے دیا۔ میرزا نے فوراً ہی ان دونوں کو ہال کے سرے پر واقع کمرے میں پہونچایا۔ پھر منتقل شدہ اسلحہ آٹھ آدمیوں میں تقسیم کردیا گیا اور وہ لوگ پہلے سے طے شدہ جگہوں پر مستعدی سے ڈٹ گئے۔ محسن اور سلمان ایک بر پھر باہر نکل گئے کچھ وقفہ کے بعد ٹھیک پہلے ہی کی طرح وہ دوبارہ آٹھ کلاشنکوف کے ساتھ اندرونی حصہ میں داخل ہوگئے۔ مصطفی نے مسافروں کے انتظار کے لئے بنائے گئے نسبتاً وسیع ہال کا جائزہ پہلے ہی لے لیا تھا۔ اسکی مسافت تقریباً تین سو مربع میں تھی۔ اس کے مشرق و مغرب دونوں جانب عرشے بنے ہوئے تھے۔ مشرقی عرشہ

ہوائی پٹی کی طرف تھا۔ یہاں ابھی بھیڑ نہیں تھی کچھ گنے چنے مخصوص لوگ یہ وہاں تھے۔ چھت موٹے موٹے لوہے کے پاءپ کے بنے متعدد ستونوں پر ٹکی تھی جن کو آپس میں لوہے کے گاٹروں منسلک کیا گیا تھا جن کے درمیاں کچھ جگہیں تھیں میرزا نے چار آدمیوں کو وہاں چھپا رکھا تھا جو اوپر سے پورے ہال پر نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ لیکن ان پر کسی کی نظر پڑنا مشکل تھا۔ پانچ افراد داخلہ کے راستہ کی نگرانی کر رہے تھے اندر داخل ہونے والا کوئی شخص بھی ان کی عقابی نگاہوں سے بچ کر اندر نہیں آسکتا تھا۔ کلاشنکوف لئے ایک شخص کنڑول روم کی چھت پر بھی موجود تھا وہ وہاں سے ہوائی جہاز رکنے کی جگہ پر اچھی طرح نظر رکھے ہوئے تھا۔اسی طرح ہوائی پٹی کی جانب واقع ہال کے مشرقی عرشے پر بھی ایک مسلح جوان ڈٹا ہوا تھا۔ وہ امام خمینی کے ہوائی جہاز سے لے کر ہال کے دروازہ تک کے طے شدہ راستہ کی نگرانی کر رہا تھا۔ سلمان اور محسن عبا قبا اور عمامہ میں ملبوس پورے حال میں ٹہل رہے تھے۔ ہادی بیک زادہ اس میز کے پاس کھڑے تھے جہاں امام کو مختصر تقریر کرنی تھی۔ میرزا اور مصطفےٰ ہوائی پٹی پر کھلنے والے دروازہ پر مستعد تھے۔

میرزا پر گویا ایک ہیجانی کیفیت طاری تھی۔ مسلسل اپنے آدمیوں کو ہدایات دے رہے تھے۔ان کی نگاہ حاج محسن پر پڑی جو مجمع کو اسٹیج سے دور کرنے کی کوشش میں لگے تھے۔اس وقت استقبال کے لئے آنے والے سبھی لوگ وہان جمع ہو چکے تھے۔ مجلس انقلاب کے تمام اراکین، اقلیتوں کے سیاسی اور مذہبی نمائدے، تحریک انقلابی کے نام پر جیلوں میں رہ چکے کچھ سر برآوردہ اشخاص، حوزۂ علمیہ قم سے آئے علماء کرام اسی طرح کی اور اہم شخصیتوں سے پورا ہال بھر گیا تھا۔ آیۃ اللہ مطہری، آیۃ اللہ بہشتی، آیۃ اللہ منتظری، آیۃ اللہ طالقانی، ڈاکٹر مفتح اور چند علماء جنہیں میرزا نہیں پہچانتے تھے، ہال کے آخری حصے

میں کھڑے تھے میرزا تیزی سے حاج محسن کے پاس آئے اور بولے! ان حضرات کا اگلی صف میں نہ ہونا درست نہیں ہے۔ آقا محسن میرزا کا مقصد سمجھ گئے اور آگے بڑھ کر بلند آواز میں بولے! برائے مہربانی راستہ دیجئے! علماء کو آگے آنے دیجئے۔ آپ لوگ سامنے سے ہٹ جایئے! میرزا تیزی سے علماء کی جانب پہنچے اور ان سے آگے آنے کی گذارش کی پھر ان لوگوں کو اگلی صف تک پہچانے کے بعد فوراً ہی ہوائی پٹی کی طرف کھلنے والے دروازہ پر پہنچ گئے۔

اور آخر کار وہ گھڑی آپہچی جسکا سبھی کو انتظار تھا جو شہیدوں کی آرزو تھی۔

ہوائی جہاز زمین پر اتر گیا ہے۔ یہ خبر ملتے ہی پورہال نعرۂ صلوۃ سے گونج اٹھا۔ ویسے سبھی پریشان دکھ رہے تھے کسی حادثہ یا سازش کا احتمال بعید نہیں تھا۔ میرزا کی گھبراہٹ کا ٹھکانہ نہ تھا۔ اسکول رفاہ میں ہوئی گفتگو ان کے ذہن میں گونج رہی تھی۔ وہ خطرہ محسوس کرر ہے تھے۔ لیکن اس کی نوعیت وہ خود نہیں سمجھ پارہے تھے۔ تیزی سے گردش کرتی ہوئی ان کی عقابی نگاہیں پورے ہال میں ناچ رہی تھیں۔ انہوں نے ایک ایک کر کے تمام مسلح افراد کی جانب دیکھا سبھی کو اپنی جگہ مستعد پایا۔ ان کا دل پہلو میں گویا ہتھوڑے چلا رہا تھا۔ فی الحال ان کی ساری تشویش ہوائی جہاز کے صحیح وسالم زمین پر اترنے کو لے کر تھی۔ اور اب جہاز ان کے کھڑے ہونے کی جگہ سے دو سو میٹر کی دوری پر کھڑا تھا۔ مصطفیٰ بہت بے چین تھے۔ پہلے سے طے شدہ پروگرام کے تحت ہوائی جہاز کو دو سو ستّر ڈگری زاویے پر مڑ کر رکنا تھا لیکن اسکی مخالفت کی گئی تھی۔ مصطفیٰ نے اشارہ سے میرزا کو نزدیک بلایا اور بولے! کنٹرول روم نے ہمارے احکامات نہیں مانے۔ لگتا ہے ان لوگوں کے ذہن میں کچھ ہے۔

میرزا بولے! جاؤ عرشے پر موجود افراد کو مزید ہوشیار رہنے کو کہو۔ مصطفےٰ نے سرعت کے ساتھ عرشے کی طرف دوڑ پڑے وہاں سے ہوائی جہاز صاف نظر آرہا تھا۔ سیڑھیاں لگادی گئیں تھیں اور پھر جہاز کا دروازہ کھلا۔ فرانسیسی پائلٹ سب سے پہلے سیڑھیوں پر نظر آیا اور اسکے ٹھیک پیچھے امام خمینی سیڑھی اتر رہے تھے۔ مصطفی فوراً میرزا کے پاس لوٹ آئے۔ میرزا کی نگاہ جوں ہی امام پر پڑی ان کے چہرے کا رنگ تبدیل ہو گیا۔امام کے پیچھے ان کے بیٹے احمد خمینی تھے۔ میرزا نے ان کے پیچھے موجود آدمی کو فوراً پہچان لیا یہ حاج مہدی عراقی تھے۔انکی نگاہیں چاروں طرف تیزی سے گردش کررہی تھیں۔ میرزا کی بے چینی تھوڑا کم ہوئی۔ امام نیلے رنگ کی ایک بنز میں سوار ہوئے یہ گاڑی ایر فورس کے افسران لے کے آئے تھے۔ کار مذکورہ ہال کی جانب جانے والی گیلری کے دروازہ پر رکی۔ امام خمینی نہایت اطمینان سے ترے اور ایر فورس کا شکریہ ادا کرنے کے لئے ہاتھ ہلایا۔اور پھر ہال کی طرف چل پڑے۔ میرزا کو گویا یقین نہیں ہورہا تھا انہوں نے جلدی سے دروازہ کھولا۔ امام ہال سے منسلک گیلری میں داخل ہوئے۔ مصطفی ہاتھ پھیلائے ہوئے بے اختیار امام کی طرف بڑھے وہ زار و قطار رو رہے تھے۔امام نے انہیں جذباتی ہیجان میں مبتلا دیکھا تو گلے سے لگالیا۔ باوجود اس کے کہ امام ان کو نہیں پہچانتے تھے۔

مصطفےٰ نے برسوں اسی لمحہ کے لئے سختیاں اور مصیبتیں اٹھائی تھیں۔ مصطفےٰ والہانہ امام کے ہاتھ اور پیشانی کو بوسہ لے رہے تھے۔ پھر اچانک انہیں حالات کی نزاکت یاد آگئی انہوں نے خود کو سنبھالا۔ میرزا نے بڑھ کر امام کا ہاتھ چوم لیا۔ پھر وہ امام کو تقریر کی جگہ لے گئے۔ جیسے ہی مجمع کی نگاہ امام پر پڑی پورا ہال درود و سلام سے گونج اٹھا۔امام ہال میں داخل ہوئے ایک نگاہ وہاں موجود لوگوں پر ڈالی اور اسٹیج پر رکھی کرسی پر بیٹھ گئے۔ امام کے

نزدیک کھڑے بیک زادہ کی گرفت ان کے اسلحہ پر مضبوط ہو گئی تھی۔ وہ بڑی تیزی سے موجود لوگوں کو باری باری دیکھ رہے تھے۔ عرشے پر نظم پڑھنے والوں نے سب کی توجہ اپنی طرف مرکوز کرلی تھی امام نے ایک نگاہ ان پر بھی ڈالی۔ بچوں کی دلنشیں آواز نے مجمع کے اضطراب کو کچھ کم کر دیا تھا۔ نظم کے اختتام پر امام خمینی نے مختصر تقریر کی جس میں انتظامیہ اور استقبال کے لئے آنے والوں کا شکریہ ادا کیا اور بختیار کو شرارتوں سے باز آنے کی نصیحت کی۔

ہوائی اڈے کے باہر جمع بھیڑ امید سے بہت زیادہ تھی۔ مجبوراً گاڑیوں کو ہوائی پٹی کی طرف لے جایا گیا۔ لیکن دس میں سے صرف پانچ گاڑیاں آدمیوں کے سیلاب کو پار کر سکیں۔ بلیزر کار کے چاروں طرف چار نبز کھڑی کر دی گئی امام خمینی انتظار ہال سے نکلے اور میرزا کی رہنمائی میں گاڑیوں کی طرف چل پڑے۔ ایر فورس کے افسران جو ابھی تک امام کے ساتھ تھے انہوں نے فوجی سلام کیا۔ امام نے ان کی طرف دیکھا اور ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا! غور سے سنو میں کیا کہہ رہا ہوں۔ ہم چاہتے ہیں ہماری فوج سربلند رہے۔ ہوشیار رہو کہ کوئی تمہیں دھوکہ نہ دے سکے! افسروں نے مزید نظم اور جوش کے ساتھ ایک بار پھر امام کو فوجی سلام کیا۔

حاج محسن بلیزر کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے تھے۔ انہوں نے امام کے لئے گاڑی کا دروازہ کھولا امام اس سے پہلے کہ گاڑی میں بیٹھے ان کی نگاہ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے ایک شخص پر پڑی امام نے حاج محسن کی طرف رخ کرکے کہا! اس گاڑی میں صرف احمد میرے ساتھ بیٹھیں گے۔ اگر کوئی دوسرا بھی ساتھ ہوا تو آگے چل کر مسئلہ کھڑا ہو سکتا ہے۔ جو شخص گاڑی میں بیٹھا تھا فوراً نیچے اتر گیا۔ میرزا امام کی دقت نظری پر حیرت زدہ رہ گئے۔ اس

ہنگامی حالات میں بھی چھوٹی چھوٹی چیزوں پر اتنی گہری نگاہ! مصطفی نے امام سے عرض کیا! حضور آپ پچھلی سیٹ پر بیٹھئے امام ان کی طرف پلٹے اور پوچھا! کیوں آگے بیٹھنے میں کیا دقت ہے؟ حاج مصطفیٰ نے جواب دیا! حضور اگلے حصہ میں لگا شیشہ بلٹ پروف نہیں ہے۔ یہ سنتے ہی امام نے مسکراتے ہوئے بڑے نرم لہجے میں کہا! بلٹ پروف کیا چیز ہے! میں ایک طالب علم ہوں! کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ کسی اعلیٰ حضرت کو سوار کر رہے ہو! پھر اپنے فرزند احمد کو اشارہ سے پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کو کہااور خود آگے بیٹھ گئے۔ حاج محسن نے گاڑی کا انجن چالو کیا۔ میرزااور بقیہ افراد دوسری گاڑیوں میں سوار ہوگئے۔ حمید اور بیک زادہ اس بنز میں سوار تھے جو ٹھیک بلیزر کے پیچھے چل رہی تھی۔ جیسے ہی یہ گاڑیاں حرکت میں آئیں ایک طرف کھڑی دس موٹر سائیکلیں اسٹارٹ ہوئیں اور اسن کے آگے آگے چلنے لگی وہ بھیڑ کو ہٹانے کی پوری کوشش کر رہی تھیں۔ ہوائی اڈے کے احاطہ سے خارج ہو کر جیسے ہی گاڑیاں سڑک کی جانب آئیں مجمع نے گاڑیوں کو چاروں طرف سے گھیر لیا یہاں تک کہ گاڑیاں ڈرائیور کے قابو سے باہر ہو گئی تھیں۔ لوگوں نے ان گاڑیوں کو اپنے ہاتھوں پر اٹھالیا تھا۔ خود امام کی گاڑی طوفان میں پھنسی کشتی کی طرح ہچکولے لے رہی تھی۔ اس گاڑی کے چاروں طرف چلنے والی گاڑیاں ایک ایک کر کے پیچھے رہ گئی ان کا سڑک پر چلنا محال ہو گیا تھا۔ میرزا فوراًاپنی گاڑی سے اترے اور امام کی بنز کے آگے پہنچے۔ وہ ہاتھ اٹھا کر چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے۔ کنارے ہٹ جاؤ، راستہ بناؤ، گاڑی کو آگے جانے دو، ان کو دیکھ کر کچھ لوگ اور بھی بھیڑ کو ایک جانب کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ بڑی کوششوں کے بعد ذرا سا راستہ ہموار ہوا۔ حاج محسن نے دوبارہ گاڑی آگے بڑھائی۔ لیکن ایک بار پھر گاڑی لوگوں کے ہاتھوں پر حرکت کر رہی تھی۔ حاج محسن نے شیشوں کو چڑھا

دیا تھا اور سارے دروازے مقفل کر دیئے تھے۔ انہوں نے کسی حد تک ایسے حالات کی پیش بینی کی تھی اس لئے دروازوں کے تالے خاص طور سے بنوائے تھے جو ان کے علاوہ نہ باہر سے کوئی کھول سکتا تھا اور نہ ہی اندر سے۔ حاج محسن پسینہ سے شرابور ہو رہے تھے۔ امام نے ان کے پریشان حال چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا!

کیوں پریشان ہو، کوئی بات نہیں ہوئی، لوگ جانتے ہیں کہ انہیں کیا کرنا چاہئے۔

حضور ایسے میں ہم آگے نہیں چل سکیں گے۔

تھوڑا حوصلہ رکھو۔ تم اس وقت عشق کے سیلاب سے روبرو ہو اس جوش و ولولے کا مقابلہ ہمارا تمہارا کام نہیں۔ سب کچھ عاشق و معشوق حقیقی کے ہاتھں میں ہے

حاج محسن تھوڑا مطمئن نظر آنے لگے۔ اب وہ اپنی ساری قوت اسٹیرنگ پر نہیں صرف کر رہے تھے۔ اب وہ میرزا کی کوششوں سے جو تھوڑا راستہ بن جاتا گاڑی اتنی ہی دور آگے بڑھاتے۔ امام خمینی کی ایک جھلک پانے کے لئے مجمع چاروں طرف سے گاڑی پر ٹوٹا پڑ رہا تھا۔ جسے کامیابی ہوتی درود و سلام پڑھتا نعرے لگاتا۔ حاج محسن کی گاڑی ایک ایک قدم آگے بڑھ رہی تھی۔ بڑی مشکلوں سے وہ مین روڈ پر پہنچے۔ امام کی نگاہ شہیاد چوراہے پر پڑی۔ تاحد نظر انسانوں کا سیلاب نظر آرہا تھا۔ استقبال کے لئے لوگ کئی کیلومیٹر میں پھیلے ہوئے تھے۔ اتنی بڑی تعداد نے بڑے بڑے محاسبین کو دانتوں تلے انگلی رکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ چوراہے کے نزدیک میرزا دوڑتے ہوئے گاڑی کے پاس آئے وہ شیشہ پر ہاتھ رکھے کچھ کہنا چاہتے تھے یہ دیکھ کر حاج محسن نے ایک شیشہ نیچے کی طرف سرکایا میرزا چیخ کر بولے! حالات تمہارے قابو سے باہر ہو چکے ہیں اب ہم لوگ تمہارے

ساتھ نہیں چل سکتے۔ تین افراد تمہاری گاڑی کی چھت پر ہیں جو راستہ بھی مناسب دکھے اسی سے بہشت زہرا پہونچو میں اب وہیں ملاقات کرونگا۔ حاج محسن نے سر کو اثبات میں جنبش دی اور فوراً شیشہ چڑھا دیا۔ اس وقت گاڑی شہیاد چوراہے تک پہنچ گئی تھی۔

ہر ایک امام خمینی کو خوش آمدید کہنے کے لئے ہاتھ ہلا رہا تھا۔ امام خمینی بھی اپنا ہاتھ بلند کر دیتے۔ ان کے چہرہ پر بکھری مسکراہٹ لوگوں کی خوشی کو دوبالہ کر دیتی اور اپنے رہبر کے لئے ان کے عشق میں مزید اضافہ کی باعث بنی ہوئی تھی۔ احمد خمینی جو پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ لوگوں کے ہجوم کو دیکھ کر حیران تھے ان کی نگاہیں تعجب سے چاروں طرف دیکھ رہی تھیں لیکن وہ خاموش تھے۔

آیز نہاور روڈ پر گاڑی کو کچھ راستہ ملا لیکن چو بیس اسفند نامی چوراہے پر گاڑی ایک بار پھر انسانی سیلاب میں پھنس گئی۔ یہاں بھی گاڑی چکوں کے بجائے لوگوں کے ہاتھوں پر چل رہی تھی۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق گاڑی کو تہران یونیورسٹی کے سامنے رکنا تھا۔ کیونکہ یونیورسٹی کی مسجد میں بہت سارے علماء پانچ بہمن کو امام خمینی کے ایران لوٹنے پر لگائی گئی روک کے خلاف مظاہرے میں بیٹھے تھے۔ امام خمینی ان لوگوں سے ملاقات کرنا چاہتے تھے۔ لیکن لوگوں کا اژدہام اس قدر تھا کہ گاڑی کا دروازہ بھی کھلنا محال تھا۔ اور ساتھ ہی امام خمینی کا گاڑی سے اترنا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ حاج محسن نے گاڑی کو بڑھالے جانا چاہا۔ اس پر امام خمینی نے کہا! کسی طرح بھی گاڑی کو روکو میں اترونگا۔ حاج محسن نے مجمع کی جانب دیکھتے ہوئے کہا! حضور ممکن نہیں۔ احمد خمینی بھی بول پڑے! حاج محسن صحیح کہہ رہے ہیں گاڑی سے اترنا دشواری پیدا کر سکتا ہے۔ لوگوں کو امید نہ تھی کہ استقبال کے لئے اتنے لوگ آجائیں گے۔

امام خمینی کچھ نہ بولے۔اور حاج محسن نے گاڑی آگے بڑھائی۔کار سست رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھی کہ اچانک حاج محسن کے چہرہ کا رنگ اڑ گیا انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ کار نے کسی کو کچل دیا ہے۔ساتھ ہی اطراف سے لوگ ہاتھ سے گاڑی روکنے کا اشارہ کر رہے تھے۔حاج محسن نے اپنی پوری قوت بریک پر صرف کر دی۔لوگوں نے کار کے نیچے سے ایک قوی ہیکل نوجوان کو کھینچ کر نکالا اسکا چہرہ لہولہان تھا اسکے سر میں چوٹ آئی تھی۔ایسی حالت میں بھی وہ جوان امام کو خوش آمدیدی کہنے کے لئے ہاتھ ہلا رہا تھا۔امام خمینی نے حاج محسن سے کہا! اس جوان کی طرح جو بھی زخمی ہوا ہے مراسم کے بعد سب سے معافی طلب کی جائے ہم سب مقصر ہیں۔حاج محسن بہت متوحش نظر آرہے تھے گاڑی کی اسٹیرنگ انہوں نے بڑی مضبوطی سے پکڑ رکھی تھی۔کنپٹی پر ابھری رگیں ان کے اعصاب پر پڑنے والے شدید دباؤ کا پتہ دے رہی تھیں۔انہوں نے سامنے کی جانب اس طرح نظریں جمارکھیں تھیں گویا ان کی گردن دائیں بائیں مڑنے سے قاصر ہو۔وہ سر تا پا پسینے سے نہائے ہوئے تھے۔ایک بار کار کا ایر کنڈیشن چالو کیا لیکن نہ جانے کیوں فوراً ہی بند کر دیا۔امام خمینی نے انکی جانب دیکھا اور کہا! تم ایر کنڈیشن چلا سکتے ہو بلکہ جس طرح تم کو آسانی ہو کار چلاؤ۔کیوں اس قدر پریشان ہو مطمئن رہو کوئی حادثہ رونما نہیں ہوگا اللہ پر بھروسہ رکھو۔یہ لوگ ہمارے دشمن نہیں ہیں۔بالکل نہ گھبراؤ۔حاج محسن تھوڑے مطمئن نظر آنے لگے۔اچانک ادھیڑ عمر کا ایک آدمی امام خمینی کی جانب والی کھڑکی پکڑ کر چلتی کار پر لٹک گیا۔حاج محسن کو سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے گاڑی سے کیسے دور کریں انہوں نے اپنی جانب والی کھڑکی سے سر باہر نکالا اور اسے بری طرح جھڑکنے لگے۔امام خمینی حاج محسن کی طرف گھومے اور تھوڑا تیز لہجے میں بولے! تم اس کے پیچھے کیوں پڑے ہو۔اس

وقت اسکے اوسان خود اسکے قابو میں نہیں ہیں۔ حاج محسن سنبھل کر اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ اب کار پر ہجوم آور مجمع کو وہ دوسری نگاہ سے دیکھ رہے تھے اور ان کی سمجھ میں آگیا تھا کہ امام خمینی کے لبوں پر مسکراہٹ کا سلسلہ کیوں نہیں ٹوٹ رہا ہے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ "بہشت زہرا" پہنچنے پر کیا گزرے گی۔ امام خمینی نے تاکید کر رکھی تھی کہ وہ سیدھے بہشت زہرا کے قطع شمارہ ستّرہ پر جائیں گے۔ جو انقلاب کے شہیدوں سے مخصوص ہے۔ امام خمینی استقبال کمیٹی میں موجود ایر فورس کے کچھ افسران اور پائلیٹ اس بات پر مصر تھے کہ امام خمینی کو ہوائی اڈے سے بہشت زہرا ہیلی کاپٹر کے ذریعہ لے جایا جائے۔ لیکن امام خمینی نے لوگوں کے درمیان سے گزرنا بہتر سمجھا اور امام کار سے ہی روانہ بھی ہوئے لیکن اس کے باوجود بحرانی صورت حال سے نپٹنے کے لئے ہیلی کاپٹر کا انتظام بھی کر لیا گیا تھا۔ "آرام گاہ" سڑک کے دونوں جانب کھڑے مجمع میں اکثر دوسرے صوبوں سے آئے ہوئے لوگ تھے۔ بہشت زہرا تک صرف سر ہی سر دکھ رہے تھے۔ امام خمینی سڑک کے دونوں جانب مٹّی کے بنے چھوٹے چھوٹے گھروں کو دیکھ رہے تھے۔ یہ مکانات کھلی فضا میں واقع تھے جن کے اطراف دور دور تک کوئی بڑی عمارت دکھائی نہیں دیتی تھی۔ امام نے اپنے فرزند احمد خمینی کو اشارہ سے ان مکانوں کی طرف متوجہ کیا اور کہا! دیکھوں یہ لوگ کس طرح رہ رہے ہیں۔ مجھے عوام کے اسی طبقہ سے سروکار ہے اور ان لوگوں کو بھی میرے ہی جیسے کسی شخص کی ضرورت۔

'بہشت زہرا' کے سامنے شہیاد چوراہے اور تہران دانشگاہ کی طرح ہی انسانی سیلاب امڑ اپڑا تھا۔ جیسے ہی کار بہشت زہرا کے اندر داخل ہونے والی سڑک پر آئی مجمع والہانہ کار کی طرف دوڑا۔ حاج محسن نے ایک بار پھر محسوس کیا کہ انکی گاڑی پہیوں پر بڑھنے کے بجائے انسانی

ہاتھ پر آگے پیچھے جھول رہی ہے۔ ایک بار تو کار پلٹتے پلٹتے بچی اب کار کا رخ بائیں طرف ہو گیا تھا۔ اور حاج محسن حیران و پریشان چارو طرف دیکھ رہے تھے۔ کہ انکی نگاہ میرزا پر پڑی جو لوگوں کے سر پر سے ہوتے ہوئے سینہ کے بل آگے بڑھ رہے تھے۔ وہ جس کے سر پر پہنچتے وہ خود ہی اس مصیبت سے بچنے کے لئے میرزا کو اور آگے ڈھکیل دیتا نتیجۃً میرزا بڑی سرعت کے ساتھ کار کے پاس پہنچ گئے۔ لوگ گاڑی کے بونٹ پر چڑھے آرہے تھے۔ اسی دوران کار کا انجن خاموش ہو گیا۔ حاج محسن کی لاکھ کوشش کے بعد پھر دوبارہ چالو نہیں ہو رہا تھا۔ جھنجھلاہٹ میں انہوں نے اسٹیرنگ پر ایک ہاتھ مارا اس پر ایک بار پھر امام خمینی نے انہیں اطمینان دلاتے ہوئے کہا! کیوں اس قدر پریشان ہو، بقیہ راستہ پیدل ہی چلیں گے۔

حضور والا آپ کو خدا کا واسطہ باہر نہ نکلیئے گا ورنہ غضب ہو جائے گا۔ اس بھیڑ کے درمیان سے گذر جانا ممکن ہی نہیں ہے۔ اسی دوران میرزا حاج محسن کی جانب والی کھڑکی پر پہونچ چکے تھے۔ حاج محسن نے میرزا سے کہا! انجن بند ہو گیا ہے اور کسی صورت میں بھی دوبارہ چالو نہیں ہو رہا ہے۔ میرزا بولے! یہاں سے تقریباً پچاس میٹر کی دوری پر ہیلی کاپٹر موجود ہے کار کو دھکے سے وہاں تک پہنچانا پڑے گا۔ میرزا گاڑی کے آگے کی طرف آئے اور بلند آواز میں لوگوں سے کہا کہ گاڑی کو دھکا دے کر ہیلی کوپٹر تک پہچانا ہے۔ یہ کہنا تھا کہ کار لوگوں کے ہاتھوں پر آگے بڑھنے لگی۔ میرزا آگے آگے راستہ بنا رہے تھے۔ لیکن جب مجمع کو یہ احساس ہوا کہ وہ لوگ امام خمینی کے لئے کوئی خدمت انجام دے رہیں ہیں تو خود ہی راستہ چھوڑتے چلے گئے۔ اور کار باآسانی ہیلی کاپٹر تک پہنچ گئی۔ کار اور ہیلی کاپٹر کے درمیان آدھے میٹر کا فاصلہ رکھا گیا اسی دوران مجمع کو چیرتے ہوئے ایک

بلند قد اور قوی ہیکل عالم دین آگے آئے اور اس فاصلہ کے درمیان اس طرح کھڑے ہو گئے کہ کوئی کار تک نہ پہنچ سکے۔ یہ ناطق نوری تھے۔ امام خمینی اور ان کے فرزند احمد خمینی کو ڈرائیور کی طرف والے دروازے سے ہیلی کاپٹر میں داخل ہونا تھا۔ پہلے احمد خمینی نے دروازہ کھولا اور باہر نکلے ہی تھے کہ ایک ہجوم آیا اور نزدیک تھا کہ زمین پر گر پڑتے اس سے بچنے کے لئے ان کو حاج محسن جو کار سے نکل ہی رہے تھے، کے شانے پر پیر رکھ کر ہیلی کاپٹر میں سوار ہونا پڑا۔ لوگوں کو بڑی مشکل سے دوبارہ پیچھے کیا گیا۔ پھر جناب ناطق نوری نے اشارہ سے امام خمینی سے باہر نکلنے کی درخواست کی۔ حاج محسن نے جھٹکے سے امام خمینی کو گودی میں اٹھالیا اور ہیلی کاپٹر کی طرف تقریباً کود پڑے۔ ادھر حاج محسن بھیڑ میں دب کر بے ہوش ہو گئے تھے لوگوں نے انہیں اسی کار میں رکھ کر کار کو پیچھے کی طرف دھکا دینا شروع کر دیا تاکہ ہیلی کاپٹر پرواز کر سکے۔ ہیلی کاپٹر کا پنکھا تیزی سے گردش کر رہا تھا لیکن لوگ اس کے اطراف سے ہٹنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ ہیلی کاپٹر دو مرتبہ زمین سے بلند ہوا لیکن لوگ اس کے نچلے حصہ سے لٹک جاتے تھے نتیجتاً وہ ہر بار دوبارہ زمین پر بیٹھ جارہا تھا۔ پھر میرزا آگے بڑھے اور بڑی مشکلوں سے لوگوں کو ہیلی کاپٹر سے دور کیا پھر تیسری کوشش میں ہی ہیلی کاپٹر پرواز کر سکا۔

انقلابی شہیدوں سے وابستہ بہشت زہرا کے قطعہ شمارہ سترّہ میں ہیلی کاپٹر اترنے کی جگہ بنائی گئی تھی۔ سخت حفاظتی انتظامات کے درمیان کسی کو اس مقام سے نزدیک نہیں ہونے دیا جارہا تھا۔ ہیلی کاپٹر بڑی آسانی سے زمین پر اترا۔ ہیلی کاپٹر سے نکلتے وقت بھی امام خمینی بڑے مطمئن اور آسودہ لگ رہے تھے۔ سب سے پہلے قطعہ شمارہ سترہ پر پہنچے انہوں نے ہوائی اڈے سے یہاں تک کی طولانی اور پر مشقت مسافت صرف اسی لئے

طے کی تھی کہ انقلاب کی راہ میں جان دے دینے والوں کے لئے عقیدت اور احترام کا اظہار کریں۔ یہاں فاتحہ پڑھنے کے بعد امام خمینی اسٹیج کی جانب بڑھے۔ ایک تخت کافی اونچا کر کے رکھ دیا گیا تھا تاکہ دور سے بھی تمام لوگوں کی نگاہ امام خمینی پر پڑ سکے اور اس پر ایک کرسی رکھ دی گئی تھی۔ آیۃ اللہ مفتاح نزدیک ہی کھڑے تھے امام خمینی کرسی پر بیٹھ گئے۔ کچھ بچے انقلابی نظم پڑھ رہے تھے پھر امام خمینی نے تقریر شروع کی۔ مختصر مگر پر زور تقریر پر جس کی ابتدا میں شہداء کو خراج عقیدت پیش کیا پھر بختیار کی غیر قانونی حکومت کی شدید مذمت کی۔ انہوں نے عوام کو بھروسا دلایا کہ بہت جلد ہی ایک عبوری حکومت تشکیل دی جائے گی۔ امام خمینی کی کہی باتوں کی حمایت اور تائید میں نعرہ تکبیر سے آسمان گونج اٹھتا تھا۔ لوگوں میں عجیب جوش و خروش نظر آ رہا تھا۔ امام خمینی نے تقریر ختم کی اور لاؤڈ سپیکر کو ایک طرف کنارے کرتے ہوئے اٹھے اور سیدھے ہیلی کاپٹر کی طرف چل پڑے۔ پائیلٹ حواس باختہ سا ہو گیا اور فوراً ہی پرواز کے لئے آمادہ ہونے لگا۔ تھوڑی دیر میں ہیلی کاپٹر بہشت زہرا سے بلند ہو رہا تھا۔ لوگوں کی نگاہیں دیر تک دور ہوتے ہوئے ہیلی کاپٹر کو تعاقب کرتی رہی تھیں۔ اب ہیلی کاپٹر تہران کے آباد علاقہ پر پرواز کر رہا تھا۔ امام خمینی نے پائیلٹ سے کہا کہ "ہزار تخت خوابی" ہسپتال پر اترے۔ وہ انقلابی جدوجہد میں زخمی ہوئے لوگوں کی عیادت کرنا چاہتے تھے۔ پائیلٹ کو ہسپتال کے احاطہ میں مناسب جگہ مل گئی تھی۔ اس نے وہیں ہیلی کاپٹر اتار دیا۔

آتشیں ایام

ایک عظیم انقلاب کی آہٹ سنائی دے رہی تھی۔ کون جانتا تھا کہ امام خمینی کے خلاف ایک توہین امیز مقالہ لوگوں میں اس قدر جوش ولولہ کا باعث بن جائے گا۔ سب یہ تصور کرتے تھے کہ 9 جنوری 1978 کو قم میں عوام کا عظیم مظاہرہ اور اتنی بڑی قربانی ایک جوشیلا اور جلد ہی ٹھنڈا ہو جانے والا رد عمل ہے۔ لیکن قم کے لوگوں کی شہادت کے عین چالیسویں دن تبریز کی عوام نے قیام کیا۔ لوگ سڑکوں پر نکل آئے اور حکومت شاہ کے خلاف پر جوش مظاہرہ کیا فوج نے لوگوں پر گولیاں برسادی۔ کثیر تعداد میں لوگ شہید ہو گئے۔ انقلاب شروع ہو گیا۔

اور تبریزی شہیدوں کے چہلم کے دن، تہران اور اصفہان میں لوگوں نے مظاہرہ کیا اور انقلاب نے ایک نیا رخ اختیار کر لیا۔ اب تمام شہروں اور قصبوں کے ساتھ ساتھ دور دراز کے گاؤں میں بھی حکومت کے خلاف آواز بلند ہونے لگی۔

انقلاب کا مرکز ہونے کی وجہ سے تہران میں ہر روز مظاہرہ ہوتا۔ شاہ کی فوجیں اس گمان میں تھیں کہ لوگوں پر تشدد کر کے انہیں دبا دیں گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اسی دوران انجمن "توحیدی صیف" نے اپنی ثقافتی جدوجہد میں اضافہ کیا۔ امام خمینی کی تصاویر، مختلف اعلانات اور اشتہارات کثرت سے شائع ہونے لگے۔ اور ساتھ ہی تنظیم کی فوجی شاخ نے مختلف منصوبوں پر غور و فکر کیا، امریکیوں کی عیاشی کا اڈا "خان سالار کیفے" کا بم سے اڑا دیا جانا طے پایا اور اسی طرح کچھ اور مہمیں انجمن کے اگلے لائحہ عمل میں شامل کی گئی۔ ان میں کافتہ خان سالار کو بم سے اڑا دینے کے بعد امریکی فوج کی بس کا بم سے اڑا دینا

سر فہرست تھا۔ اس کے بعد شاہ کو جان سے مار دینے کا منصوبہ تھا جس کے لئے تدابیر اور بھرپور غور و فکر کی ضرورت تھی۔ میرزا کا ارادہ یہ تھا کہ امریکیوں کو مار کر، لوگوں کی زبان زد نعرہ "امریکہ مردہ باد" کو عملی جامہ پہنایا جائے اور امریکہ کو یہ پیغام دے دیا جائے کہ اگر اس نے شاہ کی بے جا حمایت سے دوری اختیار نہیں کی تو اس کے بہت برے انجام ہوں گے۔

"خان سالار کیفے" میں بم دھماکہ کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا اس منصوبہ کی کامیابی کے لئے بڑی پیچیدہ اور دقیق تدابیریں درکار تھیں۔ ساتھ ہی منصوبہ کو نہایت مہارت اور صحیح وقت میں عملی جامہ پہنا کر اور ساتھ ہی زیادہ سے زیادہ تعداد میں عیاش اور بے لگام امریکیوں کو موت کے گھاٹ اتارا جاسکتا تھا۔ میرزا نے اس منصوبہ کے لئے اپنا بہت وقت صرف کیا اور اس کو کامیاب بنانے کے لئے پہلے ہی ہر پہلو سے چھان بین کی۔ مہم کامیاب رہی لیکن انجمن کا ایک رکن بھی شہید ہو گیا۔ میرزا نے اشتہاروں کے ذریعہ اعلان کیا کہ وہ اس کاراوائی کے ذمہ دار ہیں ایک بار پھر انجمن "توحید صف" نے حکومت کو لرزا دیا تھا۔ یہ ایک ایسا گروہ تھا جس نے مختلف اور بہت اہم کاروائیاں کیں لیکن ابھی تک نہ اسکا کوئی رکن پولس کی نگاہ میں آیا تھا نہ ہی کوئی گرفتار ہو سکا تھا۔

شہر تہران کا ہر علاقہ مظاہرین کے نعروں سے گونج رہا تھا۔ اسی طرح دوسرے مختلف شہروں میں روزانہ شدید مظاہرہ ہو رہا تھا۔ یہ مظاہرے خود لوگوں کی طرف سے ہوتے نہ کوئی تنظیم اس کا انتظام کرتی نہ کوئی رہنما اس کی دعوت دیتا۔ لوگ اپنے جوش اور جذبہ کے تحت سڑکوں پر نکل آتے۔ حکومت شاہ نے سوچا کہ فوجی حکومت کا اعلان لوگوں کو پسپا کر دے گا۔ سڑکیں فوجیوں سے بھرے ٹرک سے بھری رہتیں

لیکن لوگ نہ مرعوب ہوتے اور نہ ہی مظاہرہ سے دست بردار۔"مرگ بر شاہ"(شاہ مردہ باد)اور درود بر خمینی کی آواز ایک لمحہ کے لئے بھی خاموش نہ ہوتی۔ انجمن "توحیدی صف"کی اصفہان برانچ نے ایک کاروائی میں امریکیوں کا ایک فوجی ہیلی کاپٹر مار گرایا جس میں موجود سبھی کمانڈر مارے گئے۔"کیفے خان سالار"کی تباہی کے فوراً بعد اس ہیلی کاپٹر کے بم دھماکے سے اڑادئے جانے کے سبب امریکیوں پر دہشت طاری ہوگئی۔اس موقع پر اطلاعات کے تمام ذرائع خصوصاً اطلاع رسائی کے متحدہ دھڑے ان دو واقعات کو خصوصی طور سے پیش کر رہے تھے۔ میرزا نے یہ ارادہ کر رکھا تھا کہ امریکی افسروں کے ٹھکانے لگانے کی اس انقلابی تحریک کو جاری رکھیں گے۔ لہٰذا اس سلسلہ میں ان کا اگلا منصوبہ امریکی فوج سے بھری بس کو اڑانے کا تھا اس کے لئے میرزا نے جو"لائحہ عمل"تیار کیا اس کے مقدمات تین دن میں طے کئے گئے۔ چوتھے روز معینہ لائحہ عمل کے مطابق میرزا موٹر سائیکل پر نکل پڑے اور مختلف راستوں پر بس کا تعاقب کرتے رہے۔اور مزید مشاہدہ کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ جس وقت بس گلی سے سڑک پر آنے کے لئے اپنی سرعت میں کمی لائے گی ٹھیک اسی وقت انجمن کا کوئی رکن گرینڈ(دستی بم)بس میں پھینک دے گا۔ اس کے لئے صبح کو وقت معین کیا گیا تاکہ صبح کے سناٹے میں جب سڑک تقریباً ویران ہوتی ہے بم پھینک کر آسانی سے فرار کیا جاسکے۔

اس دن میرزا نماز صبح کے بعد تلاوت قرآن میں دیر تک مشغول رہے بارگاہِ ایزدی میں دست دعا بلند کیا اور توسل اور گریہ زاری کے ساتھ مہم پر نکلے کے معینہ وقت تک مصلیٰ نہ چھوڑا۔ گھر سے نکلتے وقت اپنے بیٹے حسین کو کچھ دیر کھلاتے رہے اسے بوسہ دیا۔ پھر صدقہ نکال کر دو گرینڈ (دستی بم) اپنی جیکٹ میں لگے نسبتاً بڑے جیبوں میں

رکھے اور بسم اللہ کہتے ہوئے گھر سے نکل پڑے۔ انکا دوست مجتبیٰ صحن خانہ میں انکا منتظر تھا۔ میرزا نے جیب سے ایک گرینڈ نکال کر مجتبیٰ کو دے دیا اور کہا۔ یاد رکھو اسی ایک گرینڈ سے کام تمام کرنا ہے۔ راستہ طویل نہ تھا جلد ہی فوجی بس نظر آگئی میرزا نے موٹر سائیکل کا کلچ دبا رکھا تھا بس مخالف سمت سے ان کی جانب آرہی تھی۔ مجتبیٰ کے زانو پر ہاتھ مار کر کہا بسم اللہ مجتبیٰ بھی زیر لب کچھ پڑھ رہے تھے۔ بس ان سے نزدیک ہو رہی تھی اور ساتھ ہی بس کو مین روڈ پر جانے کے لئے نیم دائرے کی شکل میں گھومنا تھا اس کے لئے ڈرائیور نے سرعت کم کی اسی وقت میرزا نے اپنی موٹر سائیکل ایک دم بس کے نزدیک پہونچا دی۔ پہلے سے لئے گئے جائزے کے مطابق بس کی بیچ والی کھڑکی کھلی ہوئی تھی میرزا موٹر سائیکل کو ہمیشہ کی طرح آج بھی ایسے رخ سے بس کے برابر لے گئے کہ کھڑکی سامنے آگئی مجتبیٰ نے پن نکال کر اپنے پسینہ بھرے ہاتھ سے گرینڈ بس کی طرف اچھال دیا اور فوراً ہی میرزا کے شانہ پر ہاتھ مار کر بولے، چلو نکلو۔ میرزا مجتبیٰ سے جو تھوڑے گھبرائے ہوئے تھے پہلے ہی آگاہ ہو گئے کہ گرینڈ بس کے اندر جانے کے بجائے کھڑکی کے درمیانی ستون سے ٹکرا کر واپس سڑک پر گر گیا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ کسی قسم کا ردعمل دکھاتے ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ اب اس سے بدتر اور کیا ہو سکتا تھا گرینڈ ٹھیک انکے پیچھے پھٹا۔ مجتبیٰ کو "آہ" کرنے کی فرصت بھی نہ ملی ادھر بس ڈرائیور نے یہ جاننے کے لئے کہ کیا ہوا بس روک دی، اسی وقت میرزا نے موٹر سائیکل گھمائی اور پھر بس کی طرف چل دئے۔ ادھر بس ڈرائیور دروازہ کھول کر پیچھے کی جانب دیکھ رہا تھا کہ میرزا کو اچھا موقع مل گیا انہوں نے نہایت اطمینان کے ساتھ بس کے پاس جا کر موٹر سائیکل روکی جیب سے دوسرا گرینڈ نکالا اور پن کھینچ کر بم بس کے اندر پھینک دیا اور بڑی تیزی سے موٹر سائیکل

آگے بڑھالے گئے، انہوں نے ایکسیلیٹر پر سارازور خرچ کردیا تھالیکن پھر بھی دھماکہ کی شدت صاف محسوس کی۔ اور دل ہی دل میں خدا کا شکرادا کیااور محمدؐ وآلِ محمد پر دورد بھیجتے رہے۔

تحریک انقلاب اپنی منزل مقصود کی طرف تیزی سے گامزن تھی۔ شاہ اپنے کھوکھلے وعدوں سے عوام کو مطمئن کرناچاہتا تھااس کے لئے اس نے اپنے وزیراعظم کو بھی بدل ڈالا۔ لیکن لوگوں میں انقلابی جذبات اور جوش و خروش مزید بڑھتا گیا۔ انقلابی رہبروں سے میرزا کے نزدیکی تعلقات کی وجہ سے انجمن "توحیدی صف" کو اچھے خاصے امتیازات حاصل ہوئے تھے۔ حکومت کے لئے اب اس گروہ سے مقابلہ کرنالازمی ہوگیا تھا۔ کیونکہ یہ فعال انجمن اپنی تمام ثقافتی اور عسکری سرگرمیوں کے باوجود ابھی تک منظر عام پر نہیں آئی تھی جس سے پتہ چلتا تھاکہ اسکاجوان سربراہ ایک اعلی شعور اور گہری فکر کا مالک ہے۔

امام خمینی کی عراق سے فرانس کی جانب ہجرت سے ایران کے انقلاب اور اس سے جڑی دوسری خبریں بھی دنیاکے مختلف اخباروں کی سرخیاں بننے لگی تھیں۔ اوراب دنیا والوں نے یہاں تک کہ امریکہ کے حکومتی سربراہوں نے بھی یہ مان لیا تھاکہ شاہ کا جانا طے ہے۔ اور آخرکار شاہ 16 جنوری کوایران سے فرار کرگیا۔ شاہ کے جانے کے بعد سبھی امام خمینی کی واپسی کے منتظر تھے۔ "مجلس انقلاب" کے اراکین امام خمینی کی واپسی کے تمام ضروری مقدمات کی فراہمی میں لگ گئے تھے۔ سب سے اہم اور مشکل مسئلہ امام خمینی کی حفاظت کا تھا۔ ضروری تھاکوئی ایک گروہ اسکی ذمہ داری لیتا۔ اس سلسلہ میں بحث و گفتگو ہونے لگی تھی۔ کئی تنظیموں اور فوجی گروہوں نے اپنے کواس خدمت کے لئے پیش کیا۔

لیکن "مجلس انقلاب" کے اراکین کی اکثریت "انجمن توحیدی صف" پر اتفاق رائے رکھتی تھی۔ وہ لوگ جانتے تھے کہ صرف "توحیدی صف" ہی اتنی بڑی ذمہ داری بخوبی انجام دے سکتی ہے۔ لہٰذا تمام بحث و گفتگو کے بعد یہ ذمہ داری میرزا کے کاندھوں پر ڈال دی گئی۔

میرزا نے مجلس انقلاب کو دئے گئے اپنے وعدے کے مطابق چار ہزار لوگوں کو مسلح کرنے کا ارادہ کیا۔ اگرچہ یہ کام کچھ آسان نہ تھا لیکن میرزا نے پورے ملک سے انجمن کے سبھی اراکین کو بلا لیا اور ان کو مد نظر ہدف کے لئے منظم کرنے میں لگ گئے۔ شاپور بختیار نے جو اس وقت ملک کا وزیر اعظم تھا امام خمینی کی آمد کی مخالفت کی اور اعلان کر دیا کہ وہ امام خمینی کی حفاظت کی کوئی ضمانت نہیں لے سکتا۔ اس کے حکم نے ملک کے تمام ائیرپورٹ بند کر دئے گئے لیکن لوگوں کے مظاہروں سے مجبور ہو کر ائیرپورٹ دوبارہ کھول دئے گئے۔ 2 جنوری کا دن میرزا اور ان کی انجمن کے اراکین کے لئے سخت اور بہت بھاگ دوڑ کا دن تھا۔ لہٰذا سخت حفاظتی انتظامات کے درمیان امام خمینی کا جہاز صحیح و سالم ان کی اپنے اسلامی وطن کی خاک پر آ گیا۔ امام خمینی وہاں سے تہران کے بہشت زہرا کی طرف راوانہ ہو گئے۔ وہیں پر امام خمینی نے تاریخی اعلان کیا۔ جس میں موجودہ حکومت کو غیر قانونی بتاتے ہوئے جمہوریت کی بنیاد پر نئی اسلامی حکومت کی تشکیل کا وعدہ کیا گیا۔

اس کے بعد آپ نے تہران کے اسکول "علوی" میں قیام کیا۔ 2 جنوری جس دن امام خمینی ایران واپس آئے اور 12 جنوری کے درمیان کے 10 روز ہیجانی کیفیت میں گزرے۔ اس وقفہ میں حکومت کے کچھ سر برآوردہ افراد اور ملک کے کچھ بڑے سرمایہ دار ایران سے بھاگ گئے۔ لیکن ابھی تک فوج کا سربراہ اپنے عہدہ سے برطرف

نہیں ہوا تھا۔ لیکن آخر کار فوج کے تتر بتر ہو جانے اور ایک بڑی تعداد کا امام خمینی کی پیروی کرنے سے شاہ کا یہ آخری محاز بھی انقلابیوں نے فتح کر لیا۔

انقلاب

2فروری کی صبح تھی، مدرسہ رفاہ کے صحن میں، چہل قدمی میں مصروف آیۃ اللہ مطہری کے چہرہ پر فکر مندی کے آثار نمایاں تھے۔ حاج محسن اور میرزا ان سے ایک قدم کے فاصلہ پر چل رہے تھے۔ امام خمینی کی عارضی رہائش کا مسئلہ زیر بحث تھا۔ کیا مدرسہ رفاہ مناسب جگہ ہے، مدرسہ کی یہ چھوٹی عمارت امام خمینی کے دیدار کے لئے چلی آرہی جم غفیر کے لئے ہرگز کافی نہ تھی۔ آیت اللہ مطہری نے کہا: ہم لوگوں کو کسی ایسی جگہ کا انتخاب کرنا چاہیئے تھا جہاں آنے اور جانے کے راستے الگ الگ مختلف سمتوں میں ہوں؛ لوگ ایک طرف سے اندر آئیں اور دوسری طرف سے باہر نکلیں۔ یہ مدرسہ مختلف دشواریوں کی وجہ بن سکتا ہے بہتر ہے کہ آقا کو مدرسہ علوی منتقل کر دیا جائے اس مدرسہ کی عمارت بھی بڑی ہے اور اس کے طویل و عریض صحن کے دروازے دو مختلف سڑکوں پر کھلتے ہیں۔ میرزا نے آیت اللہ مطہری کی تجویز کی حمایت کی اور کہا: مدرسہ علوی کی عمارت اپنے اطراف کی عمارتوں سے اونچی ہے جس بنا پر حفاظتی انتظامات اور بہتر طور سے انجام دئے جا سکتے ہیں۔ آقا مطہری فوراً ہی امام خمینی کے کمرے کی طرف چل پڑے، تھوڑی دیر

گفتگو کے بعد آیت اللہ مطہری نے میرزا کو آکے بتایا کہ امام خمینیؒ بھی اس بات سے راضی ہیں۔آقا مطہری نے کہا: آقا نے فرمایا ہے: "اگر اس میں لوگوں کو آسانی فراہم ہوتی ہے تو کوئی بات نہیں میں چلنے کو راضی ہوں۔" میرزا نے کہا: آس پاس کی سڑکیں اور گلیاں لوگوں سے پوری طرح بھری ہوئی ہیں۔ مدرسہ علوی یہاں سے آدھا کیلو میٹر دور ہے اگر مجمع نے آقا کو یہاں سے باہر جاتے دیکھ لیا تو بڑی دشواریاں پیش آسکتی ہیں لہٰذا کیا آقا سے یہ درخواست کی جاسکتی ہے کہ یہاں سے بغیر عمامہ اور عبا قبا کے باہر نکلیں؟

اگر آقا نے قبول نہیں کیا تو دوسری صورت کیا ہو سکتی ہے؟

اگر آپ آقا کو حالات اور اس کی نزاکتوں سے پوری طرح آگاہ کر دیجئے تو یقیناً قبول کریں گے میں ایک گاڑی اور کچھ سادہ لباس والے مسلح افراد کا انتظام کرتا ہوں۔اس کام میں جلدی ہونی چاہیئے آیت اللہ مطہری ایک بار پھر امام خمینی سے بات کرنے کے لئے ان کے کمرے کی طرف چل پڑے اور میرزا نے ساتھیوں کو اپنے پاس بلایا اور ضروری انتظامات میں لگ گئے۔ کچھ ہی دیر میں ایک "پیکان" کار مدرسہ کے دروازے پر آپہنچی تھی میرزا کے منتخب کردہ چار مسلح افراد بڑی مستعدی کے ساتھ چاروں طرف نگاہ رکھے ہوئے تھے۔اسی دوران میرزا نے دور سے آقائے مطہری کو آتے دیکھا ان کے متبسم چہرے پر نگاہ پڑتے ہی میرزا سمجھ گئے تھے کہ امام خمینیؒ نے رضامندی دے دی ہے۔

میر زا نے چار مسلح افراد کو "پیکان" کار اندر لانے کی ہدایت دی۔ میر زا نے پرانی ماڈل کی یہ کار مجمع کی توجہ سے بچنے کے لئے مہیا کی تھی۔ مدرسہ رفاہ کے اطراف لوگوں کا سیلاب تھا جس نے میر زا کو تشویش میں مبتلا کر رکھا تھا۔ کار امامؒ خمینی کے کمرے سے ممکنہ نزدیک ترین جگہ پارک کی گئی میر زا اپنے آدمیوں کو مختلف ہدایت دینے میں مشغول تھے تبھی آقائے مطہری نے انہیں اشارہ سے بتایا کہ امامؒ خمینی آمادہ ہیں۔ میر زا تیزی کے ساتھ آگے بڑھے اور گاڑی کا دروازہ کھول کر ایک بار پھر کار کا جائزہ لیا اسی دوران امامؒ خمینی کمرہ سے باہر آگئے۔ میر زا پہلی بار عبا و قبا اور عمامے کے بغیر امامؒ کو دیکھ رہے تھے۔ تعجب اور خوشی کے ملے جلے تاثر میر زا کے چہرے پر پڑھے جا سکتے تھے امامؒ خمینی کی شکل اس لباس میں کافی بدلی ہوئی لگ رہی تھی۔ میر زا کو اس بات سے خوشی ہوئی کہ کم لوگ ہی امامؒ خمینی کو پہچان سکیں گے۔ امامؒ خمینی کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے بیک زادہ ہلکی مشین گن لئے ہوئے ان کے ساتھ ہی پیچھے بیٹھے۔ ان کے علاوہ ڈرائیور اور اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا شخص بھی مسلح تھا۔ میر زا کار کے آگے آگے چل رہے تھے جیسے ہی مدرسہ کا گیٹ کھولا گیا مجمع بے تحاشا اندر داخل ہونے لگا اور ایک ریلے نے میر زا کو کار تک واپس پہنچا دیا۔ میر زا نے چلا چلا کر کہنا شروع کیا: مریض ہے ہم ایک مریض کو ہسپتال لے جانا چاہتے ہیں راستہ صاف کیجئے، پیچھے ہٹیئے۔ کچھ جوان میر زا کی مدد کے لئے آگے بڑھے اور بڑی مشکلوں سے لوگوں کے درمیان راستہ بنایا گیا۔

مجمع مدرسے میں داخل ہونے کی کوشش کر رہا تھااور کسی کی توجہ کار کی طرف نہ تھی تبھی میر زانے بھیڑ میں "سعید" کو دیکھا جو مدرسہ کے اندر جانا چاہتے تھے میر زانے انہیں تیز آواز سے پکارا۔ سعید یہاں آؤ بابا کو ہسپتال لے جانا ہے۔

سعید بڑی تیزی سے میر زا کے پاس جا پہنچے کار کے اندر نگاہ پڑتے ہی انہوں نے امامؒ کو پہچان لیا تھا۔ بھیڑ میں راستہ بنانے کے لئے وہ بھی میر زا کا ساتھ دینے لگے۔ گلے کی پوری طاقت صرف کرنے کے بعد بامشکل آدھا میٹر راستہ بنتا اور ڈرائیور فوراً ہی کار آگے بڑھاتا لیکن ایک بار پھر گاڑی مجمع میں گھر جاتی۔ کار اسی سست رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھی گلی سے نکل کر "ایرانی روڈ" پر آنے کے بعد کار سیدھے مدرسہ علوی کے گیٹ پر ہی جا کر رکی تھی اس سڑک پر مدرسہ علوی بلکہ اس کے آگے تک لوگوں کا جم غفیر تھا جو مدرسہ رفاہ کی طرف بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ امام خمینیؒ نہایت اطمینان کے ساتھ گاڑی سے اترے ایک نظر مجمع پر ڈالی۔ امام یہاں نہیں امام یہاں ہیں محمد وآل محمد پر درود بھیجو! بے پناہ مسرت سے بھری کپکپاتی ہوئی یہ آواز ایک بوڑھے شخص کی تھی جس نے امام خمینیؒ کو اس لباس میں بھی پہچان لیا تھا۔ مدرسہ کے پاس سے گذرتے ہوئے مجمع کا رخ اچانک مدرسہ کی طرف ہو گیا۔ میر زا پریشان ہو گئے امام خمینیؒ سے درخواست کی کہ فوراً اندر چلے جائیں۔ امام خمینیؒ نے میر زا کے پریشان چہرے پر ایک نگاہ کی اور مدرسہ میں داخل ہو گئے میر زا نے امام کے داخل ہوتے ہی فوراً دروازہ بند کر دیا۔ مدرسہ علوی کا رقبہ کافی بڑا تھا۔ ایک طویل و

عریض صحن جس کے سرے پر صدر دروازہ تھااور دوسری جانب دو منزلہ عمارت تھی جن کو زمین دوز طبقے کے شامل کرلینے پر تین منزلہ کہا جاسکتا تھا۔ عمارت میں سب سے پہلے ایک کافی بڑاہال تھا جس کے دونوں جانب کلاس روم بنے ہوئے تھے۔ہال کے ٹھیک سامنے ایک کافی بڑی کھڑکی لگی ہوئی تھی، ہال کی میز کرسیاں ہٹاکر فرش بچھادیا گیا تھا۔امام خمینیؒ جیسے ہی ہال سے گذر کر معینہ کمرے میں داخل ہوئے میرزانے عمارت میں داخل ہونے کا صدر دروازہ بند کر دیااور اطمینان کی سانس لی۔ پچھلے ایک گھنٹے کا اضطراب کافی کم ہو گیا تھا۔ مدرسہ چاروں طرف سے اونچی اونچی چہار دیواریوں سے گھرا ہوا تھا۔ صدر دروازہ کے علاوہ شمالی چہار دیواری میں ایک چھوٹاسادروازہ تھاجو پچھلی گلی میں کھلتا تھا جس پر میرزانے سخت پہرا لگوادیا تھا۔ یہ راستہ بڑی شخصیتوں کی آمد ورفت کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا۔میرزانے پہلی منزل کی تمام کھڑکی اوران کے دروازوں کی ایک بار پھر جانچ کی، مخدوش کھڑکیاں مقفل کروادی گئی تھیں۔میرزانے اکبر سے جوان کی ہمراہی کررہے تھے کہا: زمین دوز منزل تو بالکل بند رکھی جائے گی اور دوسری منزل پر مسلح افراد رہیں گے کیونکہ تم دیکھ ہی رہے ہو ان کھڑکیوں سے مدرسہ اور آس پاس پر پوری طرح نگاہ رکھی جاسکتی ہے پھر میرزانے دوسری منزل تک جانے والی سیڑھی کے پاس موجودہ کمروں کو اسلحہ خانے کے عنوان سے استعمال کرنے کی ہدایت دی۔

انہوں نے اکبر سے کہا کہ ہال کے آخری سرے پر باہمی ارتباط کے وسائل جیسے وائرلیس مشین وغیرہ رکھنے کا انتظام کریں اور ایک مسلح آدمی کو سیڑھی پر معین کیا جائے جو کسی کو بھی اوپری منزل پر نہ آنے دے۔ میرزا پھر چھت پر گئے اور وہاں سے اطراف کا جائزہ لیا یقیناً مدرسہ علوی کی چھت اطراف کی تمام عمارتوں سے بلند تھی اور یہاں سے آس پاس کے علاقے پر پوری طرح نظر رکھی جاسکتی تھی۔ میرزا نے چھت کے مشرقی حصہ کی طرف اکبر کو متوجہ کرتے ہوئے کہا! یہ حصہ "ایران روڈ" کے بالکل سامنے واقع ہو رہا ہے لہٰذا یہاں ایک ماہر شوٹر موجود رہنا چاہئے یہیں سے مدرسہ کے صدر دروازہ اور دور تک سڑک پر نگاہ رکھی جاسکتی ہے۔ پھر مدرسہ کے جنوبی حصے کی طرف گئے اور چار افراد کو وہاں گشت پر مامور کرنے کی تاکید کی نیز اسی طریقے سے مدرسے کے مختلف حصوں پر متعدد مسلح افراد مامور کئے گئے یقیناً حفاظتی نکتہً نگاہ سے مدرسہ پوری طرح محفوظ ہو چکا تھا۔ "عین اللہ" صدر دروازہ پر تعینات تھے اور کسی کو اندر داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ میرزا نے تین مسلح افراد کو بھیڑ میں شامل ہو کر مشکوک افراد پر نگاہ رکھنے کے لئے معین کر رکھا تھا۔ امام خمینیؒ مدرسہ علوی چلے گئے ہیں اس خبر پر مدرسہ رفاہ میں حفاظتی اراکین کی غیبت نے مہر ثبوت لگا دیا تھا اب پورا مجمع مدرسہ علوی کی طرف پلٹ گیا تھا۔ دیدار امام کا سودا سر میں لئے اب یہ سیلاب مدرسہ علوی کے صدر دروازہ پر جا پہنچا تھا اور اب مجمع کو قابو میں کرنا ناممکن سا نظر آرہا تھا۔ عین اللہ نے جب یہ حالت محسوس کی تو میرزا

کو پکار کر کہنے لگے: لوگ "آقا" کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ مجمع ہمارے قابو سے باہر ہوتا جارہا ہے۔

فی الحال ممکن نہیں ہے۔

آپ اپنے کو لوگوں کی جگہ رکھ کر سوچئے۔

عین اللہ کی بات نے میرزا کو سوچنے پر مجبور کر دیا تھا لہٰذا وہ حاج مہدی عراقی کے پاس پہنچے اور بولے: لوگ بہت اصرار کر رہے ہیں اگر آقا کی اجازت ہو تو کچھ لوگوں کو مدرسے کے اندر داخل ہونے دیا جائے تاکہ دروازہ پر ہجوم میں کچھ کمی آئے۔ حاج مہدی عراقی بولے ٹھیک ہے آقا کی رائے معلوم کرنا ضروری ہے میں کوشش کرتا ہوں۔ میرزا نے یہ انتظام کیا تھا کہ امام خمینیؒ اپنے کمرے میں کھڑکی کے سامنے بیٹھیں اور لوگ صدر دروازہ سے داخل ہو کر انکا دیدار کرتے ہوئے جنوبی دروازہ سے باہر نکل جائیں۔ مد نظر کھڑکی کے دونوں طرف محسن اور بیک زادہ مستعدی کے ساتھ موجود تھے۔ حاج مہدی عراقی جلد ہی لوٹے اور بولے کہ آقا نے اجازت دے دی ہے۔ عین اللہ نے مجمع کو اطمینان قائم رکھنے کی تلقین کرتے ہوئے دروازہ کھولا اور فوراً ایک طرف ہو گئے کہ کہیں مجمع انہیں پامال ہی نہ کر ڈالے۔ پہلی صف میں موجود لوگ گھنٹوں سے منتظر تھے؛ دروازہ کھلتے ہی بے تحاشا اندر داخل ہونے لگے۔ مختلف نعروں سے مدرسہ گونجنے لگا سب کی

نظریں مدرسہ کے اس کمرے کی کھڑکی پر لگی تھی جہاں ناظم مدرسہ بیٹھتا تھااور کھڑکی کی اس زاوئے سے بنی تھی کہ پورے صحن پر نگاہ رکھی جاسکے۔امام خمینی کا کھڑکی کے سامنے آنا تھا کہ لوگوں کا جوش وولولہ کئی گنا بڑھ گیا، نعروں سے آسمان ہل رہا تھا سبھی ایک آواز میں کہہ رہے تھے:

"ماھمہ سربازتوییم خمینی گوش بفرمان توییم خمینی"

اےامام خمینی ہم سب آپ کے سپاہی ہیں آپ کے فرمان پر سراپااطاعت ہیں!

امام خمینی آہستہ آہستہ ہاتھ ہلا کر لوگوں کا شکریہ ادا کررہے تھے۔امام خمینی کو اپنے سامنے دیکھ کر عوام کے جوش و خروش کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا سورج کی روشنی میں جھلملاتا ہوا وہ دریا سامنے تھا جسکے لئے پیاس نے مدتوں انتظار اور کوسوں سفر طے کیا تھا۔ کمرے کی جنوبی اور شرقی دونوں دیواروں میں کھڑکیاں نصب تھی امام خمینی باری باری دونوں کھڑکیوں پر جاتے تاکہ صحن مدرسہ میں داخل ہونے والے تمام افراد کا سامنا ہوسکے۔یہ سلسلہ پندرہ منٹ تک چلتارہا۔لوگ صدر دروازے سے داخل ہوتے اور جنوبی دروازہ سے نعرے لگاتے ہوئے باہر نکل جاتے تھے۔مردوں کے پیچھے خواتین کی صفیں تھیں۔امام کے دیدار کے لئے بے صبری کے ساتھ انتظار کرنے والی عورتوں سے "ایران روڈ" دور تک بھری پڑی تھی۔میرزانے توحیدی صف کو اسی موقع کے لئے معین کررکھا

تھا۔ ہجوم کی زیادتی کی وجہ سے کئی لوگ بے ہوش ہو گئے تھے جو ہاتھوں ہاتھوں پر مدرسہ کے شمالی حصہ میں واقع ایک کمرے میں منتقل کردئے جارہے تھے۔ میرزا نے اس بات کا اندازہ پہلے ہی لگا لیا تھا لہٰذا ڈاکٹر فیاضی کی قیادت میں کئی ڈاکٹروں اور نرسوں کی ٹیم سرگرم عمل تھی۔ ڈاکٹر فیاضی وہی ڈاکٹر تھے جنہوں نے ۱۵/ خرداد کی مہموں کے دوران زخمی "رحمت" کا آپریشن کیا تھا اور جس کے بعد سے ان کے اور میرزا کے درمیان تعلقات گہرے ہوتے چلے گئے تھے۔ اس دن تقریباً دو سو آدمی بھیڑ میں دب کر بے ہوش ہو گئے تھے، بعض زخمی بھی ہو گئے تھے۔ میرزا یہ ماجرا دیکھ کر مزید پریشان ہو گئے تھے انہیں معلوم تھا کہ اگلے دنوں دیدار کے لئے آنے والوں کی تعداد میں مزید اضافہ ہو گا۔ لہٰذا ان کی فکرمندی فطری تھی۔ میرزا حاج محسن کے پاس پہنچے اور بولے عورتوں کی شرکت کے سلسلہ میں ہمیں ایک بار پھر سوچنا پڑے گا۔ اگر یہ اعلان کر دیا جائے کہ فی الحال دیدار آقا کا پروگرام ملتوی کر دیا گیا ہے تو شاید اتنی بھیڑ نہ ہو۔

اس سلسلہ میں خود آقا ہی فیصلہ کریں گے۔

آپ آقا سے بات کیجئے۔

حاج محسن امام خمینی کی رائے جاننے کے لئے ان کے کمرے کی طرف چل پڑے۔ امام خمینی نے حاج محسن کی طرف دیکھا اور پوچھا: کوئی حادثہ ہو گیا ہے کیا؟

آج تقریباً دو سو عورتیں بھیڑ میں دب کر بے ہوش ہو گئی تھیں۔ کل حالات اور خراب ہو سکتے ہیں اگر آج، اجازت ہو تو خواتین کے آنے پر فی الحال پابندی لگا دی جائے۔امام خمینی ایک لمحہ خاموش رہے پھر بولے:

تم کیا سمجھتے ہو میں اور تم جیسے لوگوں نے شاہ کو ایران سے باہر نکالا ہے۔ نہیں ہر گز ایسا نہیں ہے۔ انہیں ماؤں کے حوصلوں نے پہلوی حکومت کو شکست دی ہے۔ جاؤ اور اپنے انتظامات کو مزید درست کرو اور اس کی خامیوں کو دور کرنے کی کوشش کرو جس کی بنا پر ان محترم خواتین کو اذیت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ یہی عورتیں اس انقلاب کی مالک ہے۔انہیں نہیں روکا جا سکتا یہ ان کا فطری حق ہے۔

حاج محسن کے پاس کہنے کو کچھ بھی نہ تھا چہرے پر شرمندگی کے آثار لئے باہر نکل گئے۔

دو چار دنوں بعد امام کے عمومی دیدار پروگرام میں بہتری آئی۔ دھیرے دھیرے امام کا لوگوں سے عمومی ملاقات کا سلسلہ بڑھتا جارہا تھا۔ لوگوں کی لمبی صفیں "ایران سڑک" سے "امیر کبیر سڑک" تک لگی رہتیں۔اسی طرح برجستہ شخصیتوں کا امام خمینی سے خصوصی ملاقات کرنے کا سلسلہ بھی چل رہا تھا۔اسی دوران میرزا کو خبر دی گئی کہ آصفی ہال میں ایک نہایت اہم جلسہ کا انعقاد ہونا ہے جس کا انتظام میرزا کو کرنا تھا

مدرسہ علوی کی دوسری منزل امام خمینی کی حفاظتی دستہ سے مخصوص تھی اور چھت پر سو میٹر اونچے کھمبے نصب کرکے ایک راڈر بھی لگادیا گیا تھا۔اسی ٹاور پر کچھ مشین نصب کرکے ایک ٹیلی ویژن چینل بھی وقتاً فوقتاً انقلاب ٹی وی کے عنوان سے امام خمینی کے بیانات اوراعلانات نشر کرتا۔

ہال کے وسط میں کیمرہ مین اور خبر نگاروں کے لئے جگہ مخصوص کی گئی تھی آج کا جلسہ ٹی وی پر لائِو نشر ہونے والا تھا۔میر زانے سولہ بہمن کی صبح تک تمام تیاری مکمل کر لی تھیں۔دو مسلح آدمی صدر دروازے پر تعینات تھے۔امام کے خصوصی محافظین دوسری منزل پر موجود تھے۔ایک کمرے میں کچھ مشین رکھی ہوئی تھیں وائرلس نظام سے چلنے والی ان مشینوں کے ذریعہ شہر کے مختلف اسٹیشنوں اور فوجی اڈوں پر ہونے والی گفتگو بخوبی سنی جاسکتی تھی۔فوج کو حکومت کی طرف سے ملنے والی ہدایات اور اسکے عملی جامہ پہنائے جانے سے قبل ہی شہر کے متوقعہ حالات کا اندازہ لگایاجاسکتا تھا۔اس کے علاوہ ایک بڑی مشین چھت پر بھی نصب کی گئی تھی جس پر ایک مٹر قطر کا ایک راڈار بھی لگاہوا تھا۔دراصل یہ ایک ٹیلی ویژن چینل کو کنٹرول کرتا تھا۔یہ چینل انقلاب چینل کے عنوان سے جاناجارہاتھا۔کچھ کیمرہ میں ہال میں پہلے ہی سے موجود تھے تاکہ جلسہ کی تمام کاروائیوں کو انقلاب چینل سے سیدھے نشر کیا جائے۔تہران کی عوام کو جب سے اس چینل کا علم ہوا تھا وہ امام کی تمام باتیں اسی چینل کے ذریعہ حاصل کرتے تھے۔ جلسہ میں مجلس انقلاب کے

تمام اراکین کے علاوہ کچھ اور بھی برجستہ شخصیات شامل تھیں۔ہال میں حاضر لوگوں میں سے کچھ لوگوں کو میرزا پہلی بار دیکھ رہے تھے۔ان میں ڈاکٹر یزدی، بنی صدر اور قطب زادہ یہ لوگ فرانس سے امام کے ساتھ ہی آئے تھے۔جس وقت 'اینجیز بازرگان'' ہال میں داخل ہوا اس کے ساتھ کچھ لوگ اندر گھس آئے اور کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ معمر بازرگان سیاسی امور کا ماہر تھا۔انجمن ''نہضت آزادی'' کی صدارت اسی کے ذمہ تھی۔اس نے اپنی سیاسی سرگرمی ''مصدق'' کے دور میں انجمن ''جبہہ ملی'' سے شروع کی تھی۔ پھر جب اس گروہ نے اپنے اندر پائے جانے والے تھوڑے سے مذہبی رجحان کو بھی ترک کر دیا تھا۔تو بازرگان نے اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ ایک نیا گروہ تشکیل دے ڈالا تھا۔اس وقت بازرگان آیۃاللہ طالقانی اور آیۃاللہ مطہری کے پاس بیٹھا تھا۔پہلی صف میں مجلس انقلاب کے اعضاء تھے۔جلسہ میں حوزہ قم کے کچھ نامور علماء بھی شامل تھے۔میرزا ہال کے ایک کونے میں کھڑے تھے۔ہال میں ہونے والی ہر جھوٹی بڑی بات پر ان کی گہری نگاہ تھی۔ انجینئر بازرگان کے ساتھ آنے والے لوگوں پر انکی خاص نگاہ تھی۔میرزا کو یہ لوگ اچھے نہیں لگے تھے۔امام خمینی ہال میں داخل ہوئے سب سے پہلے آیۃاللہ بہشتی اپنی جگہ سے کھڑے ہوئے اور صلوۃ سے انکا استقبال کیا۔پھر بقیہ سبھی لوگوں نے ان کے اس عمل کی پیروی کی۔امام خمینی ایک کرسی پر بیٹھ گئے یہ کرسی خاص ان کے لئے رکھی گئی تھی۔ امام خمینی کے بیٹھنے کی جگہ ایسی تھی کہ ہال میں موجود سبھی لوگوں کی نگاہ ان پر پڑ سکتی تھی۔

احمد خمینی ان کے پاس ہی کھڑے رہے۔ باقی لوگ اپنی اپنی کرسی پر بیٹھ چکے تھے۔ امام خمینی نے یہاں بھی مختصر تقریر کی اور چار دن پہلے "بہشت زہرا" میں عوام سے جو وعدہ کیا تھا یعنی 'عبوری حکومت کی تشکیل' اسے بھی عملی جامہ پہنایا۔ انہوں نے بختیار کے وزیر اعظم بنے رہنے کو غیر قانونی قرار دیا اور اسکی حکومت کو کالعدم ہونے کا اعلان کیا۔ امام خمینی کے صادر کردہ دستورات کو ایک میان سال عالم دین نے پڑھ کر سنایا وہ احمد خمینی کے اشارہ پر اسٹیج پر تشریف لائے تھے۔ وہ انقلاب کے لئے جدوجہد کرنے والوں میں ایک ایسے نمایا فرد تھے جو برسوں "شاہ" کی قید میں رہ چکے تھے۔ اور ساواک کے ظلم و تشدد کے آگے گھٹنے نہ ٹیکنے والوں میں بھی نمونہ عمل کی حیثیت رکھتے تھے۔ یقینا یہی شخص علی اکبر ہاشمی رفسنجانی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ مائک کے پیچھے انکا پر عزم چہرہ حاضرین کی نگاہوں کو جلب کئے ہوئے تھا۔ میرزا بھی دوسروں کی طرح عقیدت بھری نظروں سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ ہاشمی رفسنجانی نے امام خمینی کے صادر کردہ تمام احکامات پڑھ کر سنا دیئے۔ اس دستور کے مطابق عبوری حکومت کا وزیر اعظم انجینیئر بازرگان کو بنایا گیا اور کابینہ کی تشکیل کی ذمہ داری بھی انہیں ہی کو سونپی گئی۔ جب ہاشمی رفسنجانی امام خمینی کے حکم نامہ کو پڑھ چکے تو بازرگان مائک پر گیا۔ اور ممکنہ وزراء کے نام بتائے پھر ہر ایک کے بارے میں مختصر وضاحت کی اور اپنی حکومت کے آئندہ کے منصوبوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنی تقریر ختم کی۔

میرزا جلسہ ختم ہونے سے ذرا دیر پہلے ہی ہال سے باہر نکلے اور اطراف میں ہر طرف ایک گشت لگا کر لوٹ آئے ان کی عقابی نظر ہر پر آنے جانے والے پر تھیں۔ انہوں نے صدر دروازے کے ایک جانب واقع ایک چھوٹے دروازے پر تلاشی لینے والوں کا بھی جائزہ لیا۔ داخل ہونے والے سبھی لوگوں کو اسی دروازہ سے اندر آنے دیا جارہا تھا۔

یہ بات اگلے ہی دن تمام خبر رساں اداروں کے ذریعہ پورے ملک میں پھیل گئی۔ جس سے انقلابی لہر میں نیا جوش و ولولہ آگیا۔ اور اسی دن انجینیئر بازرگان کی حکومت کی حمایت میں ملک بھر میں بڑے پیمانے پر مظاہرے ہوئے۔ زیادہ تر لوگ یہ نعرہ لگا رہے تھے۔ "بازرگان بازرگان ہم تمہارے حامی ہیں" لیکن میرزا نے بازرگان کی مذکورہ جلسہ میں کی گئی تقریر سے یہ اندازہ لگایا تھا کہ گویا وہ زبردستی یہ ذمہ داری قبول کر رہا ہے۔ اسی لئے وہ تھوڑا آزردہ تھے۔ خاص طور پر ڈاکٹر یزدی کے سلسلہ سے تشویش میں مبتلا تھے۔ ڈاکٹر یزدی نے وزیر اعظم کی مشاورت کے ساتھ ساتھ وزارت خارجہ کی ذمہ داری بھی اٹھا رکھی تھی۔ ساتھ ہی انہوں نے اسکول علوی کے امور مین بھی کافی مداخلت کرنا شروع کر دیا تھا۔ انکی شخصیت میرزا کے لئے معمابنی ہوئی تھی۔

8فروری

8فروری کی صبح "ایران روڈ" کی صورت حال ہی کچھ اور تھی ایر فورس کے بڑے پائے کے افسروں اور پائیلٹوں کی ایک بڑی تعداد امام خمینی کی بیعت کرنے مدرسہ علوی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ مجمع انہیں دیکھ کر پر جوش انداز میں نعرے لگانے لگا۔ یہ لوگ جب مدرسہ میں داخل ہوئے تو مدرسہ میں بھی خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی تھی۔

ادھر میرزا مدرسہ میں کسی کے منتظر تھے کہ حمید اور بیک زادہ ایک بھاری بکس کے ساتھ وہاں پہونچے بیک زادہ نے ہانپتے ہوئے میرزا سے کہا! یہ گرینڈ ہیں کچھ مقدار گھر میں چھپا آیا ہوں۔ حمید ان دستی بموں کو توحید صف کے "وار مین" میں واقع اسلحہ ساز کار خانہ سے لے آئے تھے۔ میرزا نے ان دستی بموں کو امام کی حفاظت کے مد نظر منگایا تھا۔ لہٰذا ان بموں کا صحیح سالم میرزا تک پہنچ جانا انکی خوشی کا باعث بنا تھا۔ انہوں نے ایک دستی بم ہاتھ میں لے کر دیکھا پھر حمید سے بولے! لے جاؤ اور اسلحہ خانے میں رکھ دو۔ اور جو لوگ نگہبانی کر رہے ہیں ان میں ہر ایک کو ایک ایک گرینڈ دے دو۔ اور آج سے نگہبانوں کی تعداد دوگنی کر دی جائے گی۔ آج کے مظاہرہ کے بعد بختیار حرکت کر سکتا ہے۔ کچھ دیر بعد ایک بڑی بھیڑ اس طرف آگے بڑھی سب سے آگے ایک بوڑھا آدمی تھا جو بلند آواز سے "لر" لہجہ میں نعرے لگا رہا تھا۔ بوڑھے کے جوش وولولے نے میرزا کو متأثر کیا تھا۔ وہ حیرت سے اسکے پر عزم چہرہ کو دیکھتے رہے۔ امام خمینی کھڑکی پر آئے اور اس بوڑھے شخص

نے نہ جانے چلا کر کیا کہا کہ پوری بھیڑ ایک لمحہ کے لئے سکوت چھا گیا۔ پھر وہ اپنے دونوں ہاتھوں کو آسمان کی طرف بلند کر کے تیز آواز میں بولا ! اے امام زمانہ کیا آپ نے اپنے اتنے اچھے نائب کو دیکھا۔ بوڑھے کا انداز میرزا کیلئے حیران کن تھا انہوں نے محسوس کیا گویا یہ شخص برسوں سے اسی وقت کا انتظار کر رہا تھا۔ اور آج "لرستان" سے آیا ہے تا کہ امام خمینی کا دیدار کر سکے۔

ٹھیک اسی وقت سڑک کی جانب ایک شور اٹھا کچھ فوجی صدر دروازہ پر ائے ہوئے تھے میرزا سرعت کے ساتھ وہاں پہونچے، فوجی مسلح تھے۔ میرزا نے "عین اللہ" سے پوچھا! یہ لوگ کیا چاہتے ہیں۔ عین اللہ نے جواب دیا! چھاؤنی سے بھاگ کر آئے ہیں۔ تسلیم ہونے آئے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ اسلحہ ہماری تحویل میں دیں اور ساتھ ہی وردیاں تبدیل کرنا چاہتے ہیں تا کہ پہچانے نہ جا سکیں۔ گذشتہ دن سے جب امام نے فوجیوں کو چھاؤنی چھوڑنے اور عوام کی ہمنوائی کا پیغام دیا تھا اسکے بعد سے لگاتار ایسے سپاہیوں کی تعدادا میں اضافہ ہو رہا تھا۔ جنہوں نے قوم کے دامن میں پناہ لی تھی۔ اس وقت بھی ایسے ہی فوجیوں کا ایک جتھا اسکول علوی کے صدر دروازے پر کھڑا تھا۔

میرزا نے حکم دیا کہ انہیں اندر آنے دیا جائے۔ انکی تعداد سو تک پہنچتی تھی۔ ان سے اسلحے لے کر ایک ایک جوڑا نیا کپڑا دے دیا گیا یہ کپڑے عام لوگوں نے ایسے

فوجیوں کے لئے ہدیہ کیا تھا۔ اسکول کے شمالی صحن میں میرزا نے خیمے نصب کروا رکھے تھے اور انہیں میں اسلحہ جمع ہو رہا تھا۔ حاج محسن نے بحرانی صورت حال سے نپٹنے کے لئے کچھ لوگوں کو مسلح کرنے کا منصوبہ بنایا تھا لہذا انہوں نے میرزا کو تاکید کر دی تھی کہ یہ اسلحے ابھی کسی کو ہرگز نہ دئے جائیں۔ اسلحوں کا ڈھیر لگ گیا تھا۔ فوج سے سپاہیوں کا یوں جوق در جوق فرار کر کے امام کی آواز پر لبیک کہنا باعث بنا کہ امام خمینی ان کی طرف مزید توجہ دیں۔ تمام فوجی اور بلند پایہ افسران کے بیچ جو دوری موجود ہوتی ہے امام نے اس پر زیادہ روشنی ڈالنی شروع کر دی ابھی بھی فوج کے درمیان دو طبقہ کے کچھ فوجیوں سے امام کا سیدھا رابطہ تھا وہ امام سے دل و جان سے محبت کرتے تھے۔ اور امام کے لئے ہر قسم کا کام کرنے کے لئے آمادہ رہتے۔ امام ان کے ذریعہ مزید پیغامات فوجیوں تک پہنچاتے۔

میرزا کو سال گزشتہ عراق میں امام سے اپنی ملاقات یاد آرہی تھی۔ آج انکی سمجھ میں آرہا تھا کہ امام کیونکر فوج کے سب سے نچلے طبقہ کے بارے میں زیادہ تاکید کیا کرتے تھے۔ وہ یہ دیکھ کر بہت خوش تھے کہ فوج کا یہی طبقہ حکم امام پر لبیک کہنے میں سب سے آگے ہے

کیمرہ برداروں کے فلش چمکنے لگے تو ایک کمانڈر نے آگے بڑھ کر حاج محسن سے درخواست کی کہ ان لوگوں کی تصویر برداری نہ کی جائے۔ حاج محسن دوڑ کر میرزا کے

پاس پہنچے اور بولے: تمام خبر نگاروں کو اکٹھا کرو اور ان کے کیمروں سے موجودہ ایل نکوالو فی الحال ان لوگوں کا پہچانا جانا مصلحت کے خلاف ہے۔ میرزا نے فوراً ہی مؤدبانہ انداز میں تمام کیمرے خالی کروالئے اور اپنے افراد کو اس بابت بھی ہوشیار رہنے کی ہدایت دی۔آنے والے صف بستہ کھڑے امام خمینی کے منتظر تھے اور جب امام خمینی آئے تو ان لوگوں نے فوجی احترام اور سلام سے امام کا استقبال کیا۔ان کا ایک آفیسر آگے بڑھا اور اپنے اس قدم کے اسباب پر روشنی ڈالی ساتھ ہی سارے فوجیوں کی طرف سے امام خمینی اور انقلاب کی حمایت کا وعدہ کیا۔

فوجیوں کے لوٹ جانے پر میرزا تیزی سے دوسری منزل پر واقع اس کمرے میں جا پہنچے جہاں لاسلکی نظام کی کچھ ایسی مشین نصب کرر کھی تھیں جن کے ذریعہ تہران پولس اور فوجی ہیڈ کواٹر ہونے والی گفتگو سنی جا سکتی تھی۔ یہاں پہلے سے ہی کچھ افراد موجود ہی تھے جو شہر کے مختلف حصوں میں وائرلیس پر ہونے والی گفتگو سننے میں مستعدی سے مشغول تھے۔ میرزا کو اسی طریقے سے حکومت کی مختلف سازشوں اور منصوبوں کا علم ان کے عمل جامہ پہننے سے پہلے ہی ہو جاتا تھا۔ میرزا مدرسہ علوی میں ہونے والے ہر چھوٹے بڑے واقعہ کو سامنے رکھ کر حکومتی بیانات سے موازنہ کرتے اور آئندہ کے حالات کا بخوبی اندازہ لگا لیتے۔

میر زا ایک میز پر جھک گئے تھے جس پر رکھے اسپیکر سے جنزل رحیمی جو تہران میں موجود فوج کی سر براہی کر رہا تھا، کی آواز آرہی تھی۔ غصہ میں بھری اس کی آواز غیر مؤدبانہ اور فوجی اصولوں سے ہٹی ہوئی تھی وہ بڑے سخت لہجے میں حکم دے رہا تھا:

ملک اور فوج سے بغاوت کرنے والے کچھ خیانت کاروں نے خمینی سے گٹھجوڑ کر لیا ہے۔ کیا یہ ملک اور اعلیٰ حضرت (شاہ) سے وفاداری کی علامت ہے؟ ان سبھی کو ان کام کی سزا ملے گی۔ ہم اپنے خون کے آخری قطرے تک اعلیٰ حضرت (شاہ) کی حکومت اور اس عظیم نظام کی حفاظت کریں گے۔ تمام کمانڈرس کو ہدایت دے دی جائے کہ کسی بھی حکم تلافی کا جواب سیدھے فائرنگ سے دیا جائے۔آپ سب کو فائرنگ کا حکم حاصل ہے۔ یہ متعدد بار ہو چکا تھا جب میر زانے جنزل رحیمی کی گفتگو سنی تھی۔ میر زانے اندازہ لگا لیا تھا کہ اس وقت رحیمی کے مخاطب فوجی افسر اور تہران پولس کے بڑے افسران کے ساتھ ساتھ "جاودان گارڈ" کے افراد بھی تھے۔ ت جنزل رحیمی مزید کہہ رہا تھا آپ لوگ مطمئن رہیں تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔ بغاوت کا سر کچل دیا جائے گا۔ موجودہ حالات سے ہر گز خوفزدہ نہ ہوئیے اعلیٰ حضرت (شاہ) بہت جلد واپس آنے والے ہیں۔ میر زانے اپنے ایک ساتھی کو پہلے ہی اشارہ کر دیا تھا کہ رحیمی کی گفتگو کو قلمبند کرتا رہے۔ رحیمی کی یہ گفتگو میر زا پر بہت سارے مشکوک مسائل سے پردہ ہٹا رہی تھی۔

گذشتہ دن سے ہی تہران کی سڑکوں پر فوجی گشت بہت زیادہ ہوگئ تھی اور شاہ کی مخصوص فوج کالوگوں پر حملہ کرنا بھی بڑھتا جارہا تھا۔"۲۴/اسفند" نامی چوک پر شدید تصادم برپا تھا۔ایمبولینس گارڈوں کے ہارن سے شہر گونج رہا تھا زخمیوں کی تعداد بڑھتی جارہی تھی شہر کے مختلف ہسپتال بستر خالی نہ ہونے کی وجہ سے مریضوں کو بھرتی کرنے سے معذور تھے۔ ادھر ت جنرل رحیمی فوجی افسروں کو مسلسل ہدایت دے رہا تھا کہ بالکل ڈھیل نہ دی جائے کسی پر رحم نہ کیا جائے یہ شخص آسانی سے ہار ماننے والوں میں سے نہ تھا۔اس نے اپنی ساری قوت لگا رکھی تھی شاہ سے اس کی وفاداری معروف تھی وہ اپنی پوری کوشش کر رہا تھا کہ کسی طرح دم توڑتے پہلوی نظام نئ جان ڈال دی جائے۔ میرزا مسلسل اس کی باتوں پر کان لگائے تھے۔ فوج کا اگلا قدم کیا ہوگا جاننے کے لئے اس سے بہتر اور کیا طریقہ ہو سکتا تھا۔ایک بار میرزا نے اسی طریقے سے پتا لگالیا تھا کہ توحیدی صف کے اسلحے خانے اور امام خمینی کے اعلانات کو محفوظ اور منتشر کرنے کی جگہ فوج پر عیاں ہوگئ ہے اور پھر میرزا نے وہ جگہ بڑی سرعت کے ساتھ فوجی ریڈ پڑنے سے پہلے ہی خالی کروا دی تھی۔

میرزا نے آج تیار رحیمی کی گفتگو کئ بار سنی تھی انہیں کسی سازش کی بو محسوس ہورہی تھی۔ وہ رحیمی کی مختلف باتوں پر غور کر رہے تھے۔ اسی دوران ایک "سرجنٹ میجر" مدرسہ کے گیٹ پر پہنچا اور جلد از جلد میرزا سے ملاقات پر اصرار کرنے لگا۔ حاج

محسن نے اسے اندر آنے کی اجازت دی اور میرزا کے پاس لے گئے۔ "سرجنٹ میجر" نے اپنی پھولتی سانسوں پر قابو پانے سے پہلے ہی بولنا شروع کر دیا خدا کے لئے کچھ کیجئے امام ؒخمینی کی جان خطرے میں ہے وہ لوگ امام کو ختم کر دینا چاہتے ہیں، دو تین دنوں سے "لویزان چھاؤنی" میں بڑی تیاریاں ہو رہی ہیں وہ سب بالکل آمادہ ہیں۔

میرزا بولے: کیا تم ان لوگوں کے منصوبے سے واقف ہو؟

نہیں میں نے بڑی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ برے رازدارانہ انداز میں کام کیا جا رہا ہے۔ صرف یہ معلوم ہو سکا ہے کہ حملہ آج یا کل میں ہی ہو گا۔

حاج محسن کے چہرے پر بے چینی کے تاثرات پڑھے جا سکتے تھے۔ وہ حاج عراقی کے پاس پہلے اور "سرجنٹ میجر" کی گفتگو سے انہیں آگاہ کیا حاج عراقی بولے: یقیناً کوئی سازش کی جا رہی ہے۔ "لشکر گارڈ" کی دو ٹکڑیاں ہمہ وقت آمادہ ہیں۔ متعدد ٹینک شہر میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ گارڈ نے ہوائی فوج کے انقلابی افسروں پر حملہ کرنا شروع کر دیا ہے۔ ٹھیک اسی وقت میرزا بھی وہاں پہنچے اور بولے: جنرل رحیمی فوجی حکومت کا اعلان کرنے والے لوگوں کو گھروں تک محدود کرنا چاہتا ہے۔ یہ سنتے ہی حاج مہدی امام خمینی کے کمرے کی طرف چل پڑے جہاں آیت اللہ مطہری امام سے محو گفتگو تھے۔ اجازت لیکر داخل ہوئے اور ایک طرف بیٹھ گئے۔ امام خمینی کی باتوں سے انہیں معلوم ہوا کہ وہ حالات

سے پہلے ہی آگاہ ہو چکے ہیں۔ اس دن امام خمینی کی طبیعت کچھ خراب تھی پھر بھی بڑے اطمینان کے ساتھ مسائل پر گفتگو کر رہے تھے۔ حاج محسن ان سے جگہ بدل دینے کی درخواست کی لیکن امامؒ خمینی نے بے پرواہی سے کہا: آپ کو میری فکر ہے یا عوام کی جایئے کچھ ایسا کیجئے کہ کم سے کم خون بہے۔ فوج کچھ نہیں کر سکتی اگر عوام سامنے رہی تو وہ لوگ کچھ نہیں کر سکتے۔

نہتے عوام

ساری چیزیں معینہ پروگرام کے مطابق چل رہی تھیں اور اب وہ وقت آگیا تھا کہ جنرل "ھایزر" کے مشورے پر اعلیٰ فوجی افسروں نے جو منصوبہ تیار کیا تھا اسے عملی جامہ پہنایا جائے۔

جنرل ھایزر یورپ میں امریکی فوج کے کمانڈران چیف کا مشیر خاص تھا لیکن پچھلے ایک مہینہ سے ایران میں مقیم تھا اور ایک ھفتہ پہلے ایران سے جاتے وقت اس نے حالات کو بختیار کے حق میں مثبت بتایا تھا اور وہ فوجی قوت کو شدت کے ساتھ استعمال کئے جانے کا حامی تھا۔

شاہ کے ایران سے نکل جانے کے پہلے ہی "سپھد بدرہ ای" کو زمینی فوج (Army) کی کمان دے دی گئی تھی۔اس سے پہلے وہ شاہ کی مخصوص حفاظتی فوج "گارڈ جاویدان" کا جنرل انچارج تھا۔اور یہ بھی طے ہو گیا تھا کہ فوجی بغاوت کی کامیابی کی صورت میں "بختیار" کی جگہ اسے فوجی وزیر اعظم بنایا جائے گا۔اسی طرح سپھد رحیمی نے حالات پر مزید قابو پانے کے لئے فوج کی تہران ٹکڑی کا کمانڈر رہتے ہوئے کمشنر کا عہدہ بھی اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔

فوج کے چیف جنرل ربعی" نے شہر تہران کے مختلف مقامات خاص طور پر مدرسہ علوی کو جانے والی سڑک پر بمباری کرنے کا منصوبہ بنا رکھا تھا۔لیکن "دوشان تپہ "اور فرخ آباد کی چھاؤنیوں میں کچھ فوجی افسروں اور سپاہیوں کی انقلابی فعالیت کے سبب اسکا یہ منصوبہ عمل درآمد نہ ہو سکا۔کیونکہ یہ دونوں فوجی چھاؤنیاں اور "درشان تپہ "کا ائیر پورٹ امام خمینی کی قیام گاہ سے نزدیک واقع تھا۔اس لئے مذکورہ ہوائی حملوں کے لئے سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی۔

"گارڈ جاویدان" کے کمانڈر تیار ریاحی نے مظاہرین کو پسپا کرنے اور حساس جگہوں پر گولا باری کرنے کے لئے بکتر بند گاڑیوں اور توپوں سے لیس فوج بلا رکھی تھی۔ان ٹینکوں اور توپوں کی ذمہ داری اس نے اپنے نائب میجر جنرل "بیگلری" کو سونپ دی

تھی اور خود "گارڈ جاویدان" کے ذریعہ پہلے سے تعین شدہ مختلف مقامات پر حملہ کی تیاری میں لگ گیا تھا۔

میجر جنرل بیگلری نے ٹینکوں کو "لویزان" چھاؤنی میں نصب کرر کھا تھا۔ یہ فوجی سر گرمیاں جو بڑی سرعت سے انجام دی گئیں ان فوجی افسروں کے لئے مشکوک اور باعث تشویش تھیں جن کا شاہ کی حکومت سے کچھ زیادہ گہرا تعلق نہ تھا۔ ان جوانوں میں سے چار فوجی افسروں نے نہایت سرّی اور گہری تفتیش کر کے بیگلری کے مقصد کو جان لیا۔ یہ چاروں جوان گورلّا بٹالین کے سر بر آوردہ افراد تھے۔ جنہیں چھاپامار جنگ کا تجربہ بھی تھا۔

اور یہاں اس لئے مامور کئے گئے تھے کہ اپنے تجربوں سے "گارڈ جاویدان" کی رہنمائی کریں۔ فوج کے ذریعہ تختہ پلٹنے کی سازش کا پتہ سب سے پہلے "مجدی" اور "شہرام" نے لگایا تھا۔ توپوں اور ٹینکوں کا تہران کی سڑکوں پر گولا باری کرنے کے تصور نے انہیں ہلا کرر کھ دیا تھا۔ کیا ہم لوگوں نے اسی لئے اس قدر محنت و مشقت سے چھاپامار جنگ کی ٹریننگ لی ہے کہ عوام سے جنگ کریں !؟

ٹینک و توپ لے کر اپنے ہی بھائیوں کے مقابلہ میں آکھڑے ہوں !؟

لویزان چھاؤنی پر سناٹے کی حکمرانی تھی۔ فوجی اپنے بستروں پر جاچکے تھے۔

شہرام فوراًاپنے بستر سے اٹھے اور دبے قدموں "مجدی" کے پاس پہنچے اور بولے !

کیاواقعاًیہ ممکن ہے؟

یہ لوگ اپنی منفعت کے لئے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔

توپھر ہم لوگوں کو جلداز جلداپنے منصوبے پر عمل کرناچاہئے۔

شہرام، مجدی اور بقیہ دونوں فوجی افسر خواب گاہ سے باہر نکلے۔اندھیرے نے ٹینکوں اور توپوں کو پوری طرح اپنی آغوش میں لے رکھا تھاسب سے پہلے مجدی نے توپوں کے بریچ بلاک (Breech block) کی سوئیاں نکالناشروع کردیں۔(مذکورہ پرزہ نکال لینے سے توپ اور ٹینک بیکار ہوجاتے ہیں) پھر بقیہ افسروں نے بڑی تیزی سے انکا ساتھ دیناشروع کردیا۔ ساری توپوں اور ٹینکوں کے مذکورہ پرزے کوایک محفوظ جگہ پر چھپادیا۔

اگلے دن مجدی نے چھاؤنی کے اندر سے ہی میجر بیگلری کو فون کیااور سخت لہجہ میں مخاطب کر کے کہاکہ میں تمہارا ہی ایک افسر بول رہاہوں اور چھاؤنی کے اندر سے ہی تمہیں فون کررہاہوں۔ میں تم کو آگاہ کئے دے رہاہوں اگر ٹینک اور توپیں چھاؤنی سے باہر

نکالی گئیں تو ہم بغاوت کر دیں گے۔ ساتھ ہی جان لو کہ ہم نے سبھی ٹینکوں اور توپوں کے لولاس کی سوئیاں نکالی ہیں یہ کہہ کر مجدی نے سلسلہ منقطع کر دیا اور تیزی سے ٹیلی فون بوتھ سے باہر نکل گئے تاکہ دیکھ نہ لئے جائیں۔

جب بیگلری نے مجدی کی کہی باتوں کی تصدیق کرلی تو جنرل رحاحی سے رابطہ قائم کیا اور اسکے مشورہ سے یہ طے پایا کہ اب "گارڈ جاویدان" توپ اور ٹینک کے بغیر ہی سڑکوں پر قبضہ کرے گی۔ بہر حال انہیں ان چیزوں سے ہاتھ دھونا پڑا تھا جو اس فوجی بغاوت میں انکے کام آسکتی تھی۔

جنرل ریاحی کا منصوبہ اپنے پہلے ہی مرحلے میں تردد کا شکار ہو گیا تھا۔ جہاں ایک طرف "لویزان چھاؤنی" میں فوجی سامان کا ایک بڑا حصہ قابل استعمال نہیں رہ گیا تھا تو دوسری جانب ابھی تک ہوائی فوج نے کسی قسم کی سرگرمی نہیں دکھائی تھی۔ ریاحی نے سوچا کیا "خسرو داد" بھی اسی کی فوج کی طرح مشکلات سے دوچار ہو گیا ہے۔ اگر اسکے فوجی افسران بھی بغاوت پر اتر آئے تو کیا ہو گا؟ "خسرداد" کا کام ہیلی کاپٹروں کے ذریعہ ان مقامات پر بمباری کرنا تھا جن پر زمینی فوج حملہ آور ہوتی۔

لیکن ابھی تک تہران کے آسمان پر دور دور تک کسی ہیلی کاپٹر کا نام ونشان نہ تھا۔ مظاہرین کی بڑھتی ہوئی تعداد اور ہر لمحہ نئے اور غیر متوقع حالات سے دوچار ہونا

مد نظر منصوبہ کو متاثر کر رہا تھا۔ اور ان چند فوجی افسروں کی تمام پیش گوئیاں جھوٹی ثابت ہو رہی تھیں جنہوں نے بختیار کی لاعلمی میں فوجی بغاوت کے ذریعہ حکومت کا تختہ پلٹنے کا مصوبہ بنا رکھا تھا۔ ان لوگوں نے امریکی فوج کے کمانڈر ان چیف کے ساتھ اپنی آخری میٹنگ میں یہ آخری فیصلہ لیا تھا۔ ھایزر نے تہران چھوڑنے سے پہلے غیر ملکی خبر نگاروں سے کہا تھا!

میرے اس سفر کا مقصد بختیار کی حکومتی پالیسیوں اور سیاسی امور میں فوج کی دخالت کو روکنا نیز فوج کو حکومت کا حامی بنانا تھا۔

ھایزر کے مطابق اگر بختیار جمہوریت کا اعلان کرتا ہے تو ایسے میں فوجی بغاوت امریکہ کے لئے فائدہ مند ہو گی۔ اسی بنیاد پر "ت جنرل بدرہ ای" نے بختیار کی مذکورہ پیش کش کے خلاف اپنے منصوبے پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

اس رات کے حالات گواہی دے رہے تھے کہ مختلف طرز فکر کے تین الگ الگ گروہ وجود میں آرہے ہیں۔ بختیار اس فکر میں تھا کہ فوجی حمایت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جمہوریت کے نام پر عوام کی اپنی طرف کرلے۔ اور ایک جمہوری حکومت کا اعلان کرے۔ لیکن ابھی تک فوج کے اعلیٰ افسروں کو راضی نہ کر سکا تھا۔ اور جب سے اس نے چند اعلیٰ فوجی افسروں اور کچھ برجستہ سیاسی شخصیتوں کو حراست میں لینے کا حکم دیا تھا۔ بہت

سے افراد نے جیسے ت جنرل بدرہ ای، رحیمی، خسرو داد ناجی اور ربیعی جو فوج کے شدت پسند عناصر مانے جاتے تھے، بختیار سے اپنی حمایت واپس لینے کا اعلان کر دیا تھا۔ اگر چہ بختیار فوجی بغاوت سے ناآگاہ تھا لیکن انقلابی عناصر کے دباؤ میں آکر ۱۹ بہمن کی صبح میں اس نے مستعفیٰ ہو جانے کی دھمکی دی۔ اور آخر کار فوجی افسروں کے ساتھ اپنی ہمدلی کا اعلان کیا اس طرح اس نے فوج کو عوام کے قتل پر ترغیب دی۔

دوسرا گروہ تختہ پلٹنے کا منصوبہ بنانے والوں کا تھا۔ یہ لوگ اسی رات سے وارد عمل ہوئے۔ سیاسی مسائل اور عوام کی پرواہ کئے بغیر اپنے مقاصد حاصل کرنے کی تگ و دو میں لگ گئے۔

تیسرا گروہ مدرسہ علوی میں تشکیل پایا جسکا سیدھا رابطہ بیدار عوام اور انکی پُر جوش سرگرمیوں سے تھا۔ یہاں تک کہ بعض فوجی بھی ان سے آملے تھے۔ امام خمینی ہمیشہ فوج کے عام سپاہیوں کا حساب اعلیٰ افسروں سے الگ کرتے تھے۔ اور آج کے حالات میں فوج کے ان دونوں طبقوں میں واضح جدائی وقوع پذیر ہو رہی تھی۔

مدرسہ علوی میں موجود افراد بے چینی سے حالات پر گہری نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ اور انکی سرگرمیاں محض امام خمینی سے صادر شدہ احکامات پر منحصر ہوتی تھیں۔

ہر لمحہ بدلتے ہوئے حالات میں جو سیدھے انقلاب اسلامی کے مستقبل سے جڑا ہوا تھا نہ صرف میرزا بلکہ دوسرے برجستہ افراد بھی اپنے سے کوئی فیصلہ کرنے میں خود کو مجبور محسوس کر رہے تھے۔

میرزا نے اپنے گروہ کے مسلح افراد کو مدرسہ علوی اور 'ایران روڈ' پر تعین کر رکھا تھا۔ مدرسہ علوی تک آنے والی سڑک پانچ سو میٹر تک ان کی نگرانی میں تھی۔ "نیروھوائی" نامی روڈ کی جانب سے مسلسل گولیاں چلنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ "گارڈ جاویدان""دوشان تبہ" کی چھاؤنی تک پہنچ گئے تھے لیکن ایئر فورس کے جوانوں نے انکا راستہ روک دیا۔ جنگ صبح تک چلتی رہی۔ چھاؤنی کے اطراف میں لوگ بڑی تعداد میں جمع ہوگئے تھے جو ان افسروں اور سپاہیوں کی مدد کر رہے تھے۔ جس سے ایئر فورس کا حوصلہ اور بڑھا اور آخر کار 'گارڈ جاویدان' کو پیچھے ہٹنا پڑا۔

10فروری کی صبح میں جنوب کی طرف سے فرخ آباد روڈ اور شمال کی جانب سے دماوند سڑک "گارڈ" اور عوام کے مابین جنگ کا میدان بن گئی تھی۔

کچھ ٹینک سبلان سڑک سے دماوند روڈ پر آگئے تھے۔ ایک ٹینک جو "شہباز" چوراہے تک آگے بڑھ آیا تھا جیسے ہی پل کے نیچے پہونچا لوگوں نے اس پر حملہ کر دیا اور اس

میں آگ لگادی۔ "دماوند سڑک" جنگی محاذ کا نظارہ پیش کر رہی تھی۔ جس کے دونوں طرف لاتعداد خالی بوتلیں اور پٹرول سے بھرے بہت سے گیلن دکھائی دے رہے تھے۔ "گارڈ جاویدان" کا ایک ٹینک قاسم آباد روڈ پر کھلنے والے گیٹ کو توڑ کر چھاؤنی کے اندر داخل ہوگیا اور چھاؤنی کے ہوائی اڈے تک پہنچ گیا۔ جنگی طرز کا یہ چھوٹا سا ہوائی اڈّہ ایئر فورس کے ان جوانوں کے قبضہ میں تھا جو اسلامی انقلاب کے حامی تھے۔ ٹینک کے وہاں پہنچتے ہی زبردست جنگ شروع ہوگئی۔ "گارڈ جاویدان" کے مزید دو ٹینک اسی طرف کی دیوار توڑتے ہوئے اندر داخل ہوگئے۔ لوگوں نے جیسے ہی یہ دیکھا فوجیوں کی مدد کو دوڑ پڑے۔ بیلچوں اور کدالوں کے ذریعہ عقبی دیوار کو توڑ کر چھاؤنی میں داخل ہوگئے۔ گارڈوں پر لوگوں کا حملہ لحظہ بہ لحظہ شدت اختیار کرتا جارہا تھا۔ صف اوّل کے جوانوں نے گارڈوں سے کافی مقدار میں اسلحے چھین لئے تھے۔ اور پھر اس مال غنیمت کے ساتھ انکا تہران کی مختلف سڑکوں پر گشت لگانا، لوگوں کے جوش و ولولہ کو مزید بڑھا گیا۔ نظام آباد کی طرف سے جو ٹینک بھی دماوند سڑک کی جانب بڑھنے کی کوشش کرتا مجمع اُس پر پل پڑتا اور اسے اپنے قبضہ میں لے لیتا۔ ظہر کے وقت گارڈ کے جنرل نے ٹینکوں کو پیچھے ہٹ جانے کا حکم دے دیا۔

شہر تہران کی سبھی چھاؤنیاں اور سارے تھانے ابھی تک میدان جنگ بنے ہوئے تھے۔ ریڈیو پر اب بھی مسلسل جعفریاں کی آواز نشر ہو رہی تھی وہ لگاتار جنرل رحیمی

کے پیغامات سنا رہا تھا۔ جعفریاں پچھلے کئی دنوں سے ریڈیو اور ٹیلی ویژن اسٹیشن پر مستعدی سے شب و روز کام میں لگا ہوا تھا۔ وہ جنرل رحیمی کی عسکری حمایت کے ذریعہ ابھی تک مذکورہ حساس اور نہایت اہم محاذ پر قبضہ باقی رکھنے میں کامیاب رہا تھا۔

جعفریاں کی آواز نے میرزا کو چونکا دیا تھا وہ ت جنرل رحیمی کو یہ حکم دے رہا تھا کہ ریڈیو اسٹیشن کی مزید حفاظت کے لئے لشکر "گارڈ جاویدان" کی ایک اور ٹکڑی ارک چوراہے کی طرف روانہ کرے۔ میرزا نے ان دونوں کی گفتگو بڑے غور سے سنی اور بڑی عجلت کے ساتھ خود کو محافظوں کی قیام گاہ تک پہونچایا اور بولے!

تم سب تیار ہو جاؤ! ہمیں فوراً ارک چوراہے جانا ہو گا۔ لگتا ہے ٹینکوں نے عام لوگوں پر حملہ کر دیا ہے۔

میرزا پانچ آدمیوں کے ساتھ ارک چوراہے کی جانب چل پڑے ان میں سے ہر ایک نے چند عدد گرینڈ (ہتھ گولے) اپنے ساتھ لے لئے تھے۔ توپ خانہ نامی چوراہے سے ہی فائرنگ کی آواز سنائی دینا شروع ہو گئی تھی۔ ارک چوراہے سے لوگ گھبرائے ہوئے اسی طرف بھاگے چلے آرہے تھے بیک زادہ نے گاڑی کی کھڑکی سے اپنا سر باہر نکال رکھا تھا۔ وہ چیخ چیخ کر لوگوں سے راستہ بنانے کے لئے کہہ رہے تھے۔ مجمع کو جب یہ اندازہ ہوا کہ یہ لوگ ریڈیو اسٹیشن پر قبضہ کرنے کے لئے آرہے ہیں تو ان کے لئے بڑی تیزی سے

راستہ بنادیا گیا۔ بیک زادہ کے علاوہ میرزا کے ساتھ شکوری، محسن، عباس، امیر استاد ابراھیم اور مصطفیٰ ابھی تھے۔

باب ہمایون روڈ پر پہونچ کر انہوں نے گاڑی سڑک کے کنارے پارک کی اور بڑی مشکلوں سے اس بڑے مجمع کو چیرتے ہوئے آگے بڑھ پائے جس کی پوری توجہ ریڈیو اسٹیشن کی طرف تھی۔ مشین گن سے ہونے والی فائرنگ کی آواز ایک لمحہ کے لئے بھی رُک نہیں رہی تھی۔ لوگ چوراہے تک نہیں پہونچ پا رہے تھے۔

انقلابی جوان وزارت خزانہ کی عمارت کے پاس جمع تھے۔ ان میں سے محض دو جوان مسلح تھے۔ لیکن ان دو مسلح کی موجودگی میں بھی وہ لوگ ابھی تک چوراہے نہیں پہونچ سکے تھے۔

کچھ جوانوں نے جنگی ظاہری حالت گواہی دے رہی تھی کہ پچھلے چوبیس گھنٹوں سے بغیر آرام کئے تہران کی مختلف سڑکوں پر سرگرم معرکہ ہیں، جیسے ہی یہ دیکھا کہ انکی مدد کے لئے ایک مسلح گروہ آپہنچا ہے تو جوش اور خوشی سے نعرہ بلند کرتے ہوئے انہوں نے میرزا اور انکے ساتھیوں کو ہاتھوں پر اٹھالیا۔

گویا لوگ گھنٹوں سے چند مسلح افراد کا انتظار کر رہے تھے کہ جن کی مدد سے ریڈیو اسٹیشن پر تعین گارڈوں کو شکست دے سکیں۔ کچھ لوگ پر جوش انداز میں چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے۔ "چھاپامار" سپاہی آگئے ہیں۔

میرزا نے لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے بلند آواز میں کہا!

ہم لوگ امام خمینی کے فدائی ہیں۔ اور پھر لوگوں سے درخواست کی کہ وہ جگہ خالی کر دیں۔

بیک زادہ چوراہے کی طرف جانے والی سڑک سے نیچے اُتر کر کچھ آگے تک بڑھ گئے۔ ذرا سے توقف کے بعد میرزا نے دو جوانوں کے بیچ بیس میٹر کا فاصلہ رکھتے ہوئے چوراہے کی طرف بھیجا اور آخر میں خود بھی اسی طرف چل پڑے۔ لوگوں نے وزارت خزانہ کی عمارت کے پیچھے محاذ بنا رکھا تھا اور موقع کی تلاش میں تھے کہ "گارڈوں" پر حملہ آور ہو سکیں۔

ارک چوراہے پر پانچ ٹینک دیکھے جا سکتے تھے جن میں سے ہر ایک پر مشین گن نصب تھی۔ کچھ گارڈوں نے ریڈیو اسٹیشن کے اطراف اور بعض نے کاخ گلستان نامی عمارت کی چہار دیواری کے پیچھے کمین گاہ بنا رکھی تھی۔ اور مسلسل لوگوں کی طرف گولی باری کر رہے تھے۔

مصطفیٰ، وزارت خزانہ کی عمارت کی جانب سے ہونے والی گولی باری کی طرف متوجہ ہوئے جب انہوں نے یہ دیکھا کہ کچھ لاشیں بیچ سڑک پر پڑی ہوئیں ہیں تو چیخ کر بولے!

دیوار کے اوٹ سے باہر نہ نکلئے! ہوشیار رہئے! وہ لوگ وزارت خزانہ کی عمارت سے فائرنگ کررہے ہیں!

ان کی طرف بھی گولیوں کی ایک بوچھار آئی۔

میرزا پھرتی کے ساتھ زمین پر لیٹ گئے اور سینے کے بل چلتے ہوئے بیک زادہ کے پاس جا پہونچے جو ان سے آگے آگے جارہے تھے۔اس جگہ سے ٹینک صاف دکھائی دے رہے تھے۔ ٹینک کے نزدیک کھڑا افسر فوجیوں کو اشارہ سے فائرنگ جاری رکھنے کا حکم دے رہا تھا۔ "بوذر رحیمی" روڈ پر اکھٹا مجمع "گارڈوں" پر پتھراؤ کررہا تھا۔ لیکن یہ لوگ ابھی تک بیچ چوراہے تک نہیں پہونچ سکے تھے۔اور ابھی تک صرف، سڑک پر پڑی شہداء کی لاشیں اور شدید طور پر زخمی ہوئے لوگوں کو وہاں سے ہٹانے میں مشغول تھے لیکن پھر بھی چوراہے کے نزدیک سڑک پر کچھ لاشیں پڑی ہوئی تھیں جنہیں ابھی تک وہاں سے ہٹایا نہیں جاسکا تھا۔

بیک زادہ نے ٹینک کو نزدیک سے نشانہ بنانے کا فیصلہ کیا۔ مختلف اسلحوں سے لیس ہو کر 'امیر استاد ابراہیم' سے بولے !

اگر کوئی ایک ٹینک بھی اڑا دیا جائے تو محاصرہ کرنے والے اپنا دائرہ مزید تنگ کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے !

لیکن لوگوں کے پاس اسلحہ نہیں ہے !

پھر بھی وہ لوگ حملہ کے لئے تیار ہیں !

اسی دوران انہوں نے دیکھا کہ شدید فائرنگ کے باوجود کچھ جوان ان تک آ پہنچے ہیں اور "چوراہے" کی طرف آگے بڑھنے کے لئے آمادہ ہیں۔ یہ لوگ اس وقت ایک ایسی دیوار کی اوٹ میں چھپے ہوئے تھے جس سے محض پچاس میٹر کی دوری پر دشمن کا ایک ٹینک موجود تھا۔ اس بیچ بیک زادہ نے خود کو گرینڈ سے مسلح کیا اور اچانک فائرنگ کرتے ہوئے ٹینک کی طرف دوڑ پڑے۔ انکی فائرنگ نے پہلے ہی مرحلے میں تین گارڈوں کو جہنم رسید کر دیا تھا۔ فائرنگ کے ساتھ ہی انہوں نے ٹینک کی طرف گرینڈ پھینکا اور سڑک کے کنارے لیٹ گئے۔ لیکن زیادہ تامل کا وقت نہ تھا دوسرے حملہ کے لئے اٹھے اور ایک بار پھر ٹینک کی طرف دوڑ لگائی لیکن چند قدم ہی آگے بڑھ سکے تھے کہ ٹینک پر نصب مشین گن کی گولیوں نے انکے جسم کو چھلنی کر ڈالا۔ بیک زادہ نے اپنی تمام قوتوں کو جمع کیا اور اپنی

پوری کوشش کی کہ ٹینک تک جا پہونچے لیکن مشین گن کی مسلسل فائر نگ نے اس جوان کے پیر اکھاڑ دئے۔

اس جاں نثاری کو دیکھ کر لوگوں پر ہیجانی کیفیت طاری ہو گئی اور لوگ بے تحاشہ ٹینک کی طرف دوڑ پڑے میر زا بیک زادہ کی شہادت سے مبہوت رہ گئے۔انہیں یقین نہیں ہو رہا تھا کہ انکا ایک بہترین ساتھی اس طرح سے شہید ہو گیا ہے۔ میرزا کی متحیر آنکھیں بیک زادہ کی لاش پر جم سی گئی تھیں وہ اطراف سے بے خبر ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ مصطفےٰ نے کئی بار نہیں آوازیں دیں لیکن وہ متوجہ نہیں ہوئے گویا خود انکی روح انکے جسم کو نگل گئی ہو انکے اطراف سڑک پر لگنے والی چند گولیوں نے انھیں چونکایااور وہ تیزی سے سڑک پر لیٹ گئے۔

میں جارہاہوں بیک زادہ کی لاش لانے !

لیکن ہم لوگ گارڈوں کی زد پر ہیں۔پہلے انکے ٹینکوں کو بیکار بنانا ضروری ہے۔

مصطفےٰ نے دو گرینڈ ہاتھوں میں لے کر میرزا سے پوچھا اجازت ہے؟ میرزا نے مصطفےٰ پر ایک نگاہ ڈالی اور بولے !

بیک زادہ کی ذمہ داریاں ختم ہو گئیں۔ وہ ''توحیدی صف'' کا دوسرا شہید ہے۔ لیکن جب اسنے خود کو عوام کے بیچ پایا تو خود کو انہیں کا حصہ سمجھا ''توحیدی صف'' کا کوئی عضو نہیں۔ مصطفےٰ دیکھ رہے ہو! لوگ اس ظالم حکومت سے نجات پانے کے لئے کسی کام سے دریغ نہیں کر رہے ہیں

میرزا نے ٹینکوں کو نشانہ بناتے ہوئے کہا!

میں ٹینکوں کی طرف فائر کرتا ہوں تم پوری طاقت سے گرینڈ پھینکو! فاصلہ زیادہ ہے۔

مصطفےٰ نے بموں کو سنبھالا اور میرزا کہنیوں کے بل اٹھ کر ''گارڈوں'' کی طرف گولیاں چلانے لگے۔ میرزا کو فائرنگ کرتے دیکھ کر پیچھے موجود جوان آگے آگئے۔ ان میں سے بعض گارڈوں کی گولیوں کا نشانہ بن گئے۔ ایک جوان جس کے پیر میں گولی لگی تھی درد کی شدت کے باوجود خود کو ٹینک تک پہونچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرزا مسلسل فائر کر رہے تھے۔ تبھی سڑک کی دوسری جانب سے 'شکوری' بھی وہاں پہنچ گئے۔ اب ٹینکوں پر زبردست گولی باری شروع ہو گئی تھی، ٹینکوں کے پیچھے چھپے گارڈوں نے پیچھے ہٹنا شروع کر دیا۔ اب مصطفےٰ کی باری تھی کہ ہتھ گولوں سے ٹینک پر حملہ کرتے۔ مصطفےٰ ہاتھوں میں بموں کو لے کر تیزی سے آگے بڑھے اور حملہ کرنا ہی چاہتے تھے کہ عجیب منظر سے روبرو ہوئے جس سے ان کے بڑھتے قدم رُک گئے۔ اسی بیچ میرزا جست لگا کر

مصطفیٰ کے پاس جا پہنچے اور انکی کلائی پکڑلی۔ لوگوں نے ٹینک پر حملہ کر دیا تھا۔ مصطفیٰ یہ دیکھ کر متحیر رہ گئے اور بولے!

یہ لوگ ہم سے آگے نکل گئے!

جیسے ہی پہلا شخص ٹینک تک پہونچا پورا مجمع "ھمابوں سڑک" کی جانب سے ٹینک پر چڑھ دوڑا۔ گارڈوں سے اسلحے چھین لئے گئے۔ لوگوں نے مل کر ٹنیک کو پلٹ دیا اور اس میں آگ لگادی۔ بقیہ "گارڈوں" نے ہتھیار ڈال دئے۔ پھر لوگوں نے بقیہ چاروں ٹینکوں پر بھی حملہ کر دیا۔ ان ٹینکوں کی جانب سے کوئی کاروائی نہیں ہورہی تھی۔ جلد ہی ان ٹینکوں کا انجام بھی پہلے ٹینک جیسا ہی ہوا میرزا جو ابھی تک مصطفیٰ کی کلائی پکڑے ہوئے تھے بھرائی ہوئی آواز سے بولے!

دیکھ رہے ہو مصطفیٰ؟ تمہارے ہاتھوں کے گرینڈ تمہارے ہاتھوں ہی میں رہ گئے! اور یاران تیز گام نے منزل کو جالیا۔

لوگوں کا حملہ ایک فطری رد عمل تھا۔ لوگوں نے یہ ثابت کر دیا کہ یہ انقلاب پوری عوام کا انقلاب ہے۔ تاکہ کل کوئی گروہ یا انجمن اس بات کی مدعی نہ ہو کہ انقلاب میں اسکا کردار مرکزی کردار تھا۔ ہم کو مغرور نہیں ہونا چاہئے۔

مصطفٰی! تم نے دیکھا لوگوں نے کس طرح ٹینک کو پلٹ دیا۔ یہ انقلاب امام خُمینی کا انقلاب ہے، لوگوں کا انقلاب ہے، میں تو خود کو اس عظیم تحریک میں گُم پاتا ہوں

کیا یہ انقلاب معجزہ نہیں ہے؟

مصطفٰی دیکھ رہے تھے کہ لوگ ابھی بھی ٹینکوں کو آگ لگانے میں مشغول تھے۔ یہ منظر میرزا کی باتوں کا بہترین گواہ تھا۔ میرزا عوامی جذبہ کی مدح گوئی میں مشغول تھے اور اس عظیم تحریک میں خود کو صفر شمار کر رہے تھے۔ مصطفٰی نے دل ہی دل میں ایک بار پھر میرزا کی عظمت کو سلام کیا۔

حالات پر عوام کا قبضہ ہو چکا تھا۔ ایسے میں میرزا نے لوگوں کے ساتھ ریڈیو اسٹیشن میں داخل ہونے کا ارادہ ترک کر دیا۔ لوگوں نے پوری طرح ریڈیو اسٹیشن کو اپنے قبضہ میں لے لیا تھا۔ میرزا بیک زادہ کی لاش کو بیچ سڑک سے اٹھا کر فٹ پاتھ پر لے آئے تھے۔ اسی بیچ شکوری کی آواز سنائی دی!

ریڈیو پر قبضہ ہو گیا ہے۔

انکی پھولی ہوئی سانس بتا رہی تھی کہ وہ دوڑتے ہوئے یہاں پہونچے ہیں۔ میرزا نے انکی طرف دیکھا اور بولے!

اس شہید کو تم لوگ اپنے ساتھ لے جاؤ۔

بیک زادہ کی آنکھیں ابھی تک کھلی ہوئی تھیں "شکوری" نے ہاتھ پھیر کر آنکھوں کو بند کیا اور بولے!

ابھی کل انکی شادی ہونے والی تھی امام سے عقد نکاح پڑھنے کا وعدہ پہلے ہی لے چکے تھے۔ لیکن آخر وقت میں نہ جانے کیوں امام نے شادی کو کل تک کے لئے ملتوی کروادیا تھا

کچھ دیر کے بعد شکوری بولے!

اے کاش آپ نے ریڈیو سے آزادی کا پیغام سن لیا ہوتا

حاج مہدی بڑی جلدی میں تھے میرزا کا ہاتھ پکڑے ہوئے تیزی سے امام خمینی کے دفتر کے جانب بڑھے چلے جارہے تھے۔

مصطفی اور تم سے امام کو کوئی بہت اہم کام ہے تم دونوں کے منتظر ہیں

میرزا نے مصطفیٰ کو آواز دی وہ وہیں مدرسہ رفاہ میں کسی کام میں مشغول تھے پھر دونوں ایک ساتھ امام کے سامنے حاضر ہوئے۔

میرزانے دیکھا کہ امام خمینی کے سامنے شہید بہشتی بیٹھے تھے اور انکے ساتھ ہی ایک ادھیڑ عمر شخص بیٹھا ہوا ہے۔اس شخص کے مطابق اس کے پاس نہایت اہم اطلاع موجود تھی جو سوائے امام خمینی کے کسی اور سے کہنے پر راضی نہ تھا۔لہٰذاامام نے ملاقات کی اجازت دے دی تھی۔

امام خمینی نے اشارہ سے میرزااور مصطفیٰ کو بیٹھنے کو کہا!اور اطمینان بھرے لہجے میں بولے!

اس آدمی کا کہنا ہے کہ "ساواک"اور فوج کے کچھ عہدہ دار"اکباتان"نامی قصبہ کے ایک گھر میں جمع ہیں۔اور وہ لوگ کسی قسم کی سازش کا منصوبہ بنارہے ہیں۔کچھ آدمیوں کے لے کر تم دونوں خود جاؤاور انہیں گرفتار کرلو۔

میرزامذکورہ شخص سے بولے!

مہربانی کرکے اس گھر کا پتہ بتایئے ہم آپ کے مشکور ہوں گے۔

میں خود آپ لوگوں کے ساتھ چلوں گا!،وہ شخص بولا۔

میرزا،مصطفیٰ،محسن اور مزید تین مسلح آدمی فوراًہی مدنظر منزل کی طرف چل پڑے۔

"اکباتان" نامی قصبہ مہر آباد ہوائی اڈے کے شمال میں واقع تھا۔ اونچی اونچی عمارتوں پر مشتمل اس آبادی کے بعض مکانات اب بھی قابل رہائش نہ تھے۔ اور یہی مکانات خفیہ کاموں کے لئے بہترین ٹھکانہ بنے ہوئے تھے۔ میرزا اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایک گھر کے سامنے پہنچے جہاں متعدد گاڑیاں پہلے سے موجود تھیں۔ خبر لانے والے شخص نے پہلی منزل کی طرف اشارہ کیا۔ مسلح افراد نے چاروں طرف سے گھر کو گھیر لیا۔ فرار کے ممکنہ مقامات پر خاص توجہ رکھی گئی تھی۔ یہ سب لوگ مختلف ستونوں کے اوٹ سے نگرانی میں مشغول ہو گئے۔ کمرے کے اندر سے آنے والی آوازیں کئی لوگوں کی موجودگی کی خبر دے رہی تھی۔ میرزا نے مصطفےٰ کو اشارہ سے داخل ہونے کو کہا۔ مصطفےٰ قوی ہیکل تھے، انکی ایک زوردار ٹکر سے دروازے کی کنڈی اکھڑ گئی اور دروازہ پاٹ وپاٹ کھل گیا۔ مصطفےٰ نے فوراً ہی دروازہ کی اوٹ ہو کر فائرنگ شروع کر دی۔ اندر سے کسی قسم کی کوئی مزاحمت یا ردعمل نہیں ہوا۔ تھوڑا توقف کے بعد مصطفےٰ نے اندر جھانکا۔ کمرے کے اندر کا منظر دیکھ کر وہ متحیر رہ گئے۔ انھیں یقین نہیں آرہا تھا۔ گویا وہ خواب دیکھ رہے تھے۔ فوج کے افسروں کی ایک بڑی تعداد سروں پر ہاتھ رکھ کے، دیوار کی طرف رخ کئے صف بستہ کھڑے تھے۔ میرزا جو ایک ستون کے پیچھے سے یہ سارا منظر دیکھ رہے تھے مصطفےٰ کے پاس آکر بولے!

ان سب کو پہچانتے ہو مصطفےٰ؟

بہت اچھی طرح سے۔ ''انجیز بار گان'' کی سفارش پر آزاد ہونے کے بعد لگتا ہے ان سبھوں نے سیدھے یہیں آکر ڈیرا ڈالا ہے۔

لگتا ہے جنرل ''قرہ باغی'' ہمارے رد عمل کا منتظر ہے۔

اب یہ لوگ کچھ نہیں کر سکتے۔

مصطفیٰ ''قرہ باغی'' کے پاس پہنچے۔ باون سالہ اس اعلیٰ درجہ کے جنرل کو دو رات پہلے ہی انہوں نے فوجی ہیڈ کواٹر سے گرفتار کیا تھا۔ اور اس وقت دوبارہ گرفتار کر رہے تھے۔

میرزا نے مکان کے سارے حصے چھان ڈالے اور بولے !

نہیں کوئی اور نہیں ہے۔

جنرل ''قرہ باغی'' نے میرزا سے کہا۔ !

ہم میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ کھانا مہیا کرنے کے لئے یہاں سے باہر نکلتے۔ ہم یہاں قطعی محفوظ نہیں ہیں۔

تم سب یہاں کس لئے اکٹھا ہوئے تھے ؟

جنرل نے اپنے ساتھیوں کی جانب دیکھا اور گردن جھکا کر خاموش ہو رہا۔

مصطفےٰ آگے بڑھے اور بولے!

جانتے ہو کمانڈر "قرنی" فوج کے جنرال میجر بنا دیئے گئے ہیں۔ اور تم اپنے تمام درجات اور ان تمام میڈلوں کے باوجود دو کوڑی کے مہنگے ہو۔ کوئی تم پر تھوکنا پسند نہیں کرے گا۔ اگر تم میں کچھ مردانگی ہوتی تو اسی وقت کچھ کرتے جب اپنے عہدہ پر بحال تھے۔

ہم لوگ غیر جانبدار تھے۔

تو انقلاب کی کامیابی سے پہلے استعفیٰ کیوں نہیں دے دیا تھا؟

میرزا نے یہ بات بڑے سخت لہجے میں کہی اور سب کو باہر چلنے کا اشارہ کیا۔

میرزا نے ایک بس منگوا کر سب کو "مدرسہ رفاہ" منتقل کر دیا۔ اور "مدرسہ علوی" جا کر خود ہی امام خمینی کو پوری رپورٹ پیش کی۔

سازش

یہ ان دنوں کی بات ہے جب مدرسہ علوی اسلامی انقلاب کا دل بنا ہوا تھا۔ امام کی حفاظت کی سنگین ذمہ داری ابھی بھی میرزا کے کندھوں پر تھی۔ امام نے عارضی حکومت کا اعلان

کر کے عملی طور پر اسلامی حکومت کی بنیاد ڈال دی تھی۔ شاپور بختیار بالکل بے دست و پا ہو کر رہ گیا تھا۔ صرف فوج کی بعض ٹکڑیاں "ساواک" کے ہمراہ اس کی حمایت میں سڑکوں پر عوام کا خون بہارہی تھیں۔

انقلاب کی کامیابی نزدیک تھی۔ عوام میں سے بعض لوگوں نے بھی اسلحہ اٹھالیا تھا اور انقلاب کی حامی فوج کے ساتھ مل کر چھاؤنیوں، پولیس اسٹیشن اور دیگر حکومتی اداروں پر حملہ جاری تھا۔ میرزا نے مدرسہ علوی میں ایک لاسلکی کنڑول روم بنا رکھا تھا جہاں سے وہ وائرلیس کے ذریعہ مختلف فوجی افسروں سے مسلسل رابطے میں رہتے اور پورے حالات سے ہر وقت باخبر رہتے۔ اس دوران انہیں ایک اہم اطلاع یہ ملی کہ آج تک حکومت نے جو رات سے مارشل لاء لاگو کر یتی تھی اس کا وقت بدل کر شام ساڑھے چار بجے سے کر دیا گیا ہے۔ میرزا نے یہ اطلاع فوراً حاج مہدی عراقی کو دی۔ وہ فکر میں ڈوب گئے۔ میرزا بولے!

حاج آقا۔ اس کا سیدھا مطلب عوام کی سر کوبی ہے۔ وہ لوگ چاہتے ہیں کہ عوام گھر تک محدود رہے تاکہ ان کی فوج ساری سڑکوں پر پوری طرح قابض ہو سکے۔

حاج مہدی نے سر کو خفیف جنبش سے میرزا کی تائید کی اور میرزا کا شانہ پکڑ کے بولے!

میرے ساتھ آؤ۔

حاج مہدی عراقی میرزا کو ایک کمرے میں لے گئے جہاں 'شورائے انقلاب' کا جلسہ منعقد تھا۔ حاج مہدی نے بے وقت دخل اندازی کے لئے معذرت چاہی اور مذکورہ خبر سے ان لوگوں کو آگاہ کیا

آیۃاللہ بہشتی نے بڑے اطمینان اور اعتماد بھری بلند آواز میں کہا!

وہ اب کچھ نہیں بگاڑ سکتے اب فوج کے بس میں کچھ نہیں ہے۔

میرزا کو آقا بہشتی کا یہ انداز بڑا پیارا لگا تھا۔ میرزا کا دل چاہ رہا تھا کہ امام خمینی جہاد کی اجازت دے دیں۔ بس اب حکومت کا کام تمام ہی کر دیا جائے۔ شاہ کے ایران سے چلے جانے کے بعد کچھ فوجی افسر ابھی رکے ہوئے تھے۔ حالات پر قابو پانے کے لئے ڈوبتے ہوئے انسان کی طرح اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ لیکن امام خمینی کا ایران میں موجود ہونا ان کی تمام سازشوں پر پانی پھیرے دے رہا تھا۔ عارضی حکومت کے وزیر اعظم کی آواز نے میرزا کو فکر کی وادی سے باہر نکالا۔ وہ کہہ رہے تھے۔

بختیار ہمیں تشدد آمیز اقدامات کرنے پر مجبور کرنا چاہتا ہے۔ ہمیں بہت سوچ سمجھ کر کوئی قدم اٹھانا چاہیئے

آیۃاللہ مطہری کے چہرہ پر پریشانی کے آثار صاف پڑھے جا سکتے تھے۔ وہ میر زا سے مخاطب ہوئے۔

فوجی افسروں کی باتوں سے آپ کیااندازہ لگارہے ہیں ؟

میر زانے فوراًجواب دیا۔

"لشکر گارڈ" کے افسروں نے اپنی شکست تسلیم کرلی ہے لیکن جنرل ریاحی نے مقابلہ پر جمے رہنے کا حکم دیا ہے۔ اسنے گارڈ کی تمام ٹکڑیوں کو حکم دے رکھا ہے کہ مظاہرین کو پسپا کرنے کے لئے طاقت کااستعمال کریں نیز یہ تاکید کرر کھی ہے کہ شام ساڑھے چار بجے کے بعد لوگوں کو سڑک پر نہ آنے دیں اور نہ ماننے والوں پر دیکھتے ہی گولی چلانے کا حکم دے دیا ہے۔

آیۃاللہ بہشتی کھڑے ہو گئے اور بولے !

میں اس سلسلہ میں امام کی رائے جاننے کے لئے جارہا ہوں۔ وہ جو کہیں گے وہی انجام دیا جائے گا۔

دن کے ڈھائی بج رہے تھے میر زاامام کے کمرے کے عقبی حصے میں ٹہل رہے تھے۔ امام نے آقائی ہاشمی رفسنجانی کو بلوایا تھا جو امام خمینی کے بیانات پڑھ کر سنایا کرتے

تھے۔ میرزا پیش نظر مسئلہ پر امام کی رائے جاننے کے لئے نہایت مضطرب تھے۔ ملکی اور غیر ملکی خبر نگاروں سے مدرسہ کا ہال بھرا ہوا تھا۔ آقائی رفسنجانی جلدی ہی باہر آئے اور میرزا سے بولے آیئے اور میرزا کے ساتھ ہال میں داخل ہوئے۔ آقائی رفسنجانی نے امام کا بیان پڑھ کر سنایا۔

"فوجی حکومت کا آج والا اعلان سازش ہے اور شریعت کے خلاف ہے۔ کسی صورت میں بھی اس حکم کی پرواہ نہ کی جائے۔ عوام خوف زدہ نہ ہو۔ خدا کا فیصلہ ہے حق ہی کامیاب ہے"

خبر فوراً ہی پورے تہران میں پھیل گئی۔ مظاہرے جلد ہی فوج اور عوام کے درمیان تصادم میں تبدیل ہونے لگے۔ میرزا مدرسہ کے ایک مخصوص کمرہ میں بیٹھے مختلف قسم کی مشینوں پر جھکے ہوئے جنرل رحیمی کی باتیں سننے کی کوشش کر رہے تھے۔ فوجی حکومت کے سربراہ کی ہلکی ہلکی آواز ایک مشین سے منسلک اسپیکر سے آرہی تھی۔ میرزا نے نہ جانے کہاں کہاں سے کل پُرزے اکھٹے کر کے یہ انتظام کیا تھا اور مدرسہ علوی میں بیٹھ کر حکومت کے مختلف دفاتر کی آوازیں سننے اور ان کی سازشوں کا پردہ فاش کیا کرتے تھے اس کی باتوں سے عیاں تھا کہ ابھی تک اس نے امام خمینی کا بیان نہیں سنا ہے وہ کہہ رہا تھا۔ تم لوگ ساڑھے چار بجے کے بعد کام شروع کر سکتے ہو! زرھی لشکر تمہاری عدد کے

لئے اطراف کے شہروں سے آپہونچیں گے۔ تیار معتمدی اپنے لشکر کے ساتھ قزوین سے چل پڑا ہے۔ وہ لوگ جلد ہی تہران پہونچ جائیں گے

میرزا کے چہرہ پر ذہنی کشمکش کے آثار نمایاں تھے ہر لحہ "لشکر گارڈ" اور عوام کے درمیان تصادم کی خبریں آرہی تھیں۔ میرزا اپنے کچھ مسلح ساتھیوں کے ساتھ سڑک کی جانب نکلے۔ ان کا ارادہ تھا کہ عوام کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر لشکر گارڈ کا مقابلہ کریں۔ اس روز سڑکیں پورے دن اور پوری رات میدان جنگ بنی رہیں۔ عوام نے تمام پولیس اسٹیشنوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ اور اب حالات فوج کے قابو سے باہر ہو گئے تھے۔

امام خمینی اور عوام نے حکومت کی سازش کے جزئیات کا علم ہوئے بغیر ٹھیک وہی قدم اٹھایا تھا جو سازش کو ناکام کر دینے کے لئے اٹھایا جا سکتا تھا۔ میرزا سڑک پر نکل آئے تھے تاکہ امام خمینیؒ کے اعلان کا لوگوں پر کیا ردّ عمل ہوا ہے دیکھ سکیں۔ تبھی ان کی نگاہ ایک جوان پر پڑی جسے وہ بخوبی پہچانتے تھے۔ آقا محسن یہاں کیا کر رہے ہیں؟ یعنی وہ تہران لوٹ آئے ہیں؟ ایسے حالات میں آقا محسن کو دیکھ کر میرزا بہت خوش ہوئے۔ پچھلے چار مہینوں میں میرزا نے آقا محسن سے متعدد مرتبہ ملاقات کی تھی، آقا محسن "گروہ منصورون" کی نمائندگی میں میرزا سے ملاقات کرتے تھے۔ چنانچہ میرزا نے امام خمینیؒ کی حفاظت کے سلسلہ میں لازمی اسلحہ حاصل کرنے کے لئے "منصورون" سے بھی کافی مدد

حاصل کی تھی۔ میرزا نے آگے بڑھ کر آقا محسن کا ہاتھ پکڑا اور انہیں مجمع سے باہر لے آئے۔ آقا محسن میرزا سے مل کر بڑے خوش ہوئے اور انہیں جلدی جلدی بتانے لگے کہ ان کا گروہ بھی گزشتہ تین دنوں سے سرگرم عمل ہے اور اب تک متعدد چھاونیوں اور پولس اسٹیشنوں پر حملہ کئے جا چکے ہیں۔آج کی رات انقلاب کی فیصلہ کن رات ہے۔ میرزا نے اس کو مدرسہ علوی کی آخری خبر سے آگاہ کرتے ہوئے کہا: اگر لوگ سڑکوں پر ڈٹے رہیں تو فوج کچھ نہیں کر سکتی۔ ہم لوگوں کو مسلح ہو کر مجمع عام سڑک پر آجانا چاہئے۔آقا محسن نے ایک نظر لوگوں پر ڈالی اور کہا: ہم لوگوں کے مسلح ہو کر سرے عام نکل آنے سے لوگوں کے حوصلوں کو مزید تقویت ملے گی۔ میرزا محسن کو لیکے اسلحہ خانہ کی طرف چل پڑے کچھ ہی دیر بعد ان دونوں کے ہاتھوں میں "Z3" تھی۔ یہ لوگ ابھی چند قدم ہی آگے بڑھے تھے کہ دو ٹریلر ان کے سامنے آکر رکی۔ ٹریلر چلانے والوں نے میرزا سے پوچھا: کہاں کیا ارادہ ہے۔ میرزا نے کہا ہم لوگ سڑک پر گشت لگانے جا رہے ہیں تاکہ اگر "گارڈ: والے لوگوں پر حملہ کا ارادہ کریں تو ان کا مقابلہ کیا جائے۔ ٹریلر ڈرائیور خوش ہو کر بولا: جلدی سوار ہو جایئے۔ ہم جانتے ہیں گارڈ والوں نے کہاں مورچہ بنا رکھا ہے۔ایک ٹریلر پر میرزا اور دوسرے پر آقا محسن سوار ہو گئے ان دونوں نے سفید اور لال ڈورے والے رومال اپنے سروں پر اس باندھ رکھے تھے کہ چہرہ بھی چھپا ہوا تھا۔انہوں نے اپنی اپنی بندوقوں کو اس طرح ہاتھوں پر اٹھا رکھا تھا کہ سڑک پر موجود لوگوں کو صاف نظر آئے۔ یہ دیکھ کر مجمع میں

سے کچھ جوان بھی دوڑ کر ٹریلر پر سوار ہوگے اور بڑے جوشیلے انداز میں نعرے لگانے لگے۔ٹریلر "ژالہ چوک" سے ہوتا ہوا "شہباز روڈ" پر مڑ گئے تھے۔ٹریلر ڈرائیور مسلسل ہارن دے رہے تھے جس سے لوگوں کی توجہ مزید ان کی طرف مبذول ہو رہی تھی اور فلسطینی چھاپامار لڑاکوں کے لباس میں دو مسلح افراد کو دیکھ کر ان کے جوش و ولولے میں مزید اضافہ ہو رہا تھا۔

مجمع ہاتھ ہلا ہلا کر ان جوانوں کا استقبال کر رہا تھا۔میرزا کا منصوبہ کامیاب رہا تھا اس وقت دیر رات سڑک پر عوامی ہجوم دیکھ کر میرزا بہت خوش تھے۔ٹریلر "خراسان چوک" جہاں گارڈ والوں نے ٹھکانہ بنا رکھا تھا، سے بھی گزرا لیکن "گارڈوں" کا کوئی ردّ عمل نہ دکھا اور ٹریلر آگے بڑھتا چلا گیا تو میرزا نے ڈرائیور سے کہا کہ اب "رے روڈ" پر نکل چلو اور مجھے مدرسہ علوی کے سامنے اتار دینا۔رخصت کے وقت آقا محسن نے میرزا سے کہا ہم لوگ تمام رات سڑک پر گشت کرتے رہیں گے۔آج رات متعدد پولس چوکیوں پر قبضہ کرنا ہے۔کاش آپ بھی ہمارے ساتھ ہوتے۔

خدا آپ کو کامیابی عنایت فرمائے ہم امام کو نہیں چھوڑ سکتے۔"

امام کے ہمراہ بارگاہِ عبدالعظیم میں

آدھی رات گزر چکی تھی۔ دور تک صرف سناٹے کی حکمرانی تھی۔ میرزا بذات خود چھت پر نگہبانی کررہے تھے۔ وہ تمام مشغولیات اور اہم ذمہ داروں کے ساتھ ساتھ خود بھی عام سپاہیوں کی طرح پہرہ دیتے تھے۔ اپنے خاندان کے ساتھ رات وہیں بتاتے تھے۔ میرزا نے دور سے امام کو دیکھا کہ لکڑی کے اس پل سے گزر کر اسکول کی اصل عمارت کی طرف آرہے ہیں۔ میرزا نے سوچا اتنی رات گئے کیا کام پیش آگیا۔ امام میرزا کے پاس پہونچے اور بولے! زحمتیں قبول ہوں۔ میرزا کیا حال چال ہے۔

خدا کا شکر ہے۔

امام خمینی نے مسکرا کر کہا! تمہارے بقیہ ساتھی کہاں ہیں۔

سب اپنی اپنی جگہ پر مستعد ہیں۔

اس بیچ بیک زادہ بھی نزدیک پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے امام کو سلام کیا امام نے ان کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولے! انشاء اللہ لطف خدا تمہارے شامل حال ہوگا۔ تم لوگوں کی فکر میں میں رات بھر بے چین رہتا ہوں۔ اس وقت تم لوگوں کی احوال پرسی کے لئے یہاں چلا آیا۔

یہ سنتے ہی انکی انکھیں بھر آئیں انھوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہاجناب عالی آپ مطمئن رہیئے۔اس وقت آپ آرام کریں۔ ہم تو صرف اپنے وظیفہ پر عمل کر رہے ہیں۔

نہیں میں یوں ہی ٹھیک ہوں۔ تم سب میرے لئے بہت عزیز ہو۔ میرزا سر جھکائے کھڑے رہے۔امام عمارت کی چھت پر بنی دالان میں کچھ دیر ٹہلتے رہے۔ پھر اسی معینہ راستہ سے لوٹ گئے۔

میرزااس رات صبح تک امام کی کہی باتوں کو سوچتے رہے تھے اور عشق امام میں انکی آنکھیں اشک بار تھیں۔ اگلے دن آیۃ اللہ مطہری نے میرزا سے کہا! امام حضرت عبد العظیم کی زیارت پر جاناچاہتے ہیں۔

میرزا کے دل و دماغ میں اب بھی کل رات امام کی کہی باتوں کی چاشنی موجود تھیں انھیں اچانک بنے اس پروگرام پر ذرا تعجب نہیں کیا۔

میرزانے آقامطہری سے پوچھا۔ کیاامام کا یہ زیارتی سفر غیر رسمی ہوگا۔

ہاں یقینالیکن آپ امام کے حفاظتی دستہ میں مزید اضافہ کریں گے۔امام کے ساتھ حاج مہدی بھی ہوں گے۔

بدھ کی رات تین گاڑیاں "شہر رے" روانہ ہونے کے لئے آمادہ کھڑی تھیں۔

امام خمینی اور حاج مہدی عراقی جس گاڑی میں بیٹھے تھے وہ وسط میں تھی حمید اور بیک زادہ ٹھیک اس کے پیچھے والی کار میں مسلح موجود تھے۔ میرزا کی کار سب سے آگے تھی۔ رات کافی گذر چکی تھی لہٰذا سڑکیں ویران تھیں چھوٹا سا یہ قافلہ آسانی سے راستہ طے کر رہا تھا۔ لیکن میرزا کے ذہن میں ایک سوال گونج رہا تھا۔ کیا امام محض زیارت کی غرض سے جا رہے ہیں؟ انکی نگاہ میں ایسے بحرانی حالات میں اس سفر کا مقصد صرف زیارت نہیں ہو سکتا تھا۔

عام توقع کے بر خلاف خمینی امام کو جب بھی کوئی کام پڑتا بڑی سادگی سے اسکول سے نکل پڑتے۔ اگرچہ امام کا یہ فعل میرزا کے لئے جو امام کی حفاظت کی ذمہ دار تھے مشکل ساز اور دشواریاں کھڑی کرنے والا تھا لیکن امام کی یہ ادا میرزا کے دل کو بھا جاتی۔

یہ قافلہ حرم پہنچا اور اس سے پہلے کہ لوگوں کو خبر ہوتی امام سیدھے صحن میں پہنچے اور ایک گوشہ میں بیٹھ کر نماز اور دعاؤں میں مشغول ہو گئے۔ میرزا نے بہت کوشش کی کہ وہ بھی امام کی طرح بے فکر ہو کر خضوع و خشوع سے عبادت کریں لیکن ان کی یہ سعی مفید ثابت نہیں ہوئی۔ وہ جانتے تھے کہ یقیناً امام کا یوں آسودہ خاطر ہونا لمبے عرصے کی ریاضت اور تجربہ کا نتیجہ ہے۔ آج وہ ایک عظیم انقلاب کی رہنمائی کر رہے ہیں۔ اور

حالات ایسے غیر یقینی ہیں کہ کبھی بھی کہیں بھی کوئی حادثہ پیش آسکتا ہے۔ایسے ماحول میں کیسے اس قدر مطمئن رہا جا سکتا ہے؟ یقیناامام خمینی جیسے آفاقی کردار سے ہی ممکن ہے۔ نماز پڑھنے کے بعد امام نے دعائے فرج پڑھی اسکے بعد کافی دیر تک فکر میں ڈوبے رہے۔ میرزا ہی کیا کوئی بھی امام کی اس خلوت نشینی کو نہ سمجھ سکا کسی میں کیا جرأت تھی کہ ایسے میں امام کو مخاطب کرتا۔ حاج مہدی جو برسوں سے امام کے مزاج اور ان کی عادات سے بخوبی واقف تھے ان کے پیچھے خاموش کھڑے انتظار کرتے رہے۔ جس وقت امام کھڑے ہوئے ان کے چہرے پر گہری فکر مندی کے آثار نمایاں تھے۔ حرم سے نکل کر گاڑی کی طرف چل پڑے۔ واپسی کے وقت امام کے دہن سے محض ایک جملہ نکلا تھا۔

"اس ہفتہ معاملات واضح ہو جائیں گے"

اب میرزا کو آنے والے اس پر مشقت ہفتہ کے لئے تیاریاں کرنی تھیں۔ کیونکہ امام کے مذکورہ جملہ نے ان پر گہرا اثر چھوڑا تھا۔ حرم میں امام پر کیا باتیں واضح ہوئیں جن کی بنیاد پر امام خمینی نے یہ جملہ کہا۔ یہ ایک ایسا سوال تھا جسکا جواب میرزا کو کبھی نہ مل سکا۔

ہاں اتنا ضرور ہوا کہ اب وہ پہلے سے کہیں زیادہ اپنے رہبر کے تئیں سراپا اطاعت تھے۔ جن سے وہ والہانہ عشق کرتے تھے۔

انقلاب کی رات

11 فروری کی رات پورا شہر تہران جاگ رہا تھا۔ فائرنگ کی آواز ایک لمحہ کے لئے بھی منقطع نہیں ہو رہی تھی غرض رات بھر بندوقیں آگ اگلتی رہیں اور صبح سڑکوں پر آدمیوں کا سیلاب امڈ آیا تھا۔ انقلابیوں نے شہر کے مختلف علاقوں کے متعدد پولس اسٹیشن اور فوجی ٹھکانوں پر حملہ کر کے اپنے قبضے میں لے لیا تھا اور اب صرف "گارڈ جاودان" پر قابو پانا تھا۔

ادھر میرزا مدرسہ علوی کے کنٹرول روم میں لاسلکی نظام سے کام کرنے والی مشینوں پر جھکے "جنرل رحیمی" کی باتوں کو بڑے غور سے سن رہے تھے اور اس کے اگلے قدم کو ناکام بنانے کے لئے مدرسہ علوی سے اپنے آدمیوں کو مسلسل ہدایتیں دینے میں مصروف تھے۔ ت جنرل رحیمی بچی کچھی پولس چوکیوں اور فوجی ٹھکانوں پر موجود اپنے آدمیوں کی حوصلہ افزائی کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ وہ ٹینکوں سے لیس قزوین ریجمنٹ اور گارڈ جاودان کی تمام ٹکڑیوں کو صبح تک "ایران روڈ" پہنچنے کا حکم دے رہا تھا۔ اس نے حکم دے دیا تھا کہ ۲۲ بہمن کی صبح "ایران روڈ" پوری طرح خالی ہونی چاہئے اس کے لئے فوج اور گارڈوں کو ہر قسم کی طاقت کے استعمال کی اجازت حاصل تھی۔

میرزا کی انگلیوں میں قلم تیزی سے گردش کر رہا تھا وہ مختلف ہدایات لکھ لکھ کر اپنے آدمیوں کو مختلف ماموریت پر بھیج رہے تھے۔اسی دوران ایک بار پھر جنرل رحیمی کی آواز آنا شروع ہوئی وہ پولیس اسٹیشن کے انچارج کو ڈانٹ رہا تھا۔

تم لوگوں کو اپنے ملک کے لئے جان کی بازی لگا دینی چاہیئے۔

لیکن سوائے چند افراد کے سبھی فرار کر چکے تھے۔

انچارج! تم کیا کر رہے ہو؟ تم کو انچارج تماشا دیکھنے کے لئے نہیں بنایا گیا ہے؟

سر! میں حاضر ہوں جب تک میرے پاس ایک بھی گولی موجود ہے میں بغاوت کا سر کچلنے سے پیچھے نہیں ہٹوں گا۔

تم پولیس اسٹیشن کے اندر ہی رہنا میں تمہاری مدد کے لئے کچھ لوگوں کو بھیج رہا ہوں۔

سر میں اس وقت پولیس اسٹیشن سے ملے ہوئے ایک گھر کے تہہ خانے سے بول رہا ہوں بڑی مشکل سے جان بچا کر یہاں چھپ سکا ہوں۔

اے کمبخت مردود!

میرزا نے فوراً ہی اکبر اور عین اللہ سے کہا تم لوگ فوراً پولیس اسٹیشن جا پہنچو وں صرف ایک انچارج چند کانسٹیبل کے ساتھ مل کر مقابلہ کر رہا ہے اس سے پہلے کی مدد پہنچے پولیس اسٹیشن کو اپنے قبضے میں لے لو۔

مذکورہ پولیس اسٹیشن تک پہنچنے میں اکبر اور عین اللہ نے دیر نہیں لگائی تھی۔ پولیس اسٹیشن کو چاروں طرف سے لوگوں نے گھیر رکھا تھا۔ مجمع میں صرف دو افراد مسلح تھے جو رک رک کر فائر کر رہے تھے۔ پولیس اسٹیشن کے اندر سے بھی یوں ہی وقفے وقفے سے فائر کیا جارہا تھا۔ عین اللہ نے اطراف کی عمارتوں کا جائزہ لیا اور وہ فوراً ہی سمجھ گئے کہ کس عمارت کے تہہ خانے سے وقفے وقفے سے فائرنگ ہو رہی ہے یعنی یہی وہ جگہ ہے جہاں پولیس اسٹیشن کا انچارج چھپا تھا۔ عین اللہ بجلی کے کھمبوں کی آڑ لیتے ہوئے عمارت کے نزدیک جا پہنچے اور ایک گرینڈ اس طرف اچھال دیا، دھماکے کے ساتھ ہی ساتھ عین اللہ نے اندھا دھن فائرنگ شروع کر دی۔ اکبر ٹھیک عین اللہ کے پیچھے تھے انہوں نے پولیس اسٹیشن کے ساتھ وہی کاروائی کی اور پھر دونوں ردّ عمل کے منتظر ہی تھے کہ دیکھتے ہیں چند فوجی ہاتھوں کو سروں پر اٹھائے سرنڈر کرنے کے لئے صف بستہ اندر سے باہر آرہے ہیں۔ لوگوں نے جب یہ دیکھا تو پولیس اسٹیشن پر دھاوا بول دیا۔ اکبر جو پہلے سے ہی "اسلحہ خانے" پر قبضہ کرنے کی فکر میں تھے کچھ نہ کر سکے اور لوگوں نے اسلحہ لوٹنا شروع کر دیا۔

جو بھی پولیس اسٹیشن سے باہر نکلتا اس کے ہاتھ میں کوئی نہ کوئی بندوق ہوتی ساتھ ہی ایک دوسرے سے کہتے چلو "لویزان" چلو اب "گارڈوں" کا کام ختم کرنا ہے۔

میرزا نے ایک اور گروہ کو پولیس اسٹیشن ۱۰ کو قبضے میں لینے کے لئے بھیجا اور ان کی ساری توجہ " جنرل رحیمی " کی باتیں سننے میں لگی تھی تبھی انہوں نے مدرسہ کے گیٹ پر شور و غل سنا تو بڑی تیزی سے گیٹ پر پہنچے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ مجمع دو فوجیوں کو دوڑائے ہوئے بڑی تیزی سے چلا آرہا ہے اور سب کی زبان پر ہے کہ یہ دونوں قاتل ہیں ان مجرموں کو پھانسی دے دینی چاہیئے !

میرزا نے جب غور سے دیکھا تو پہچان گئے ان میں سے ایک گارڈ جاودان کا جنرل مینیجر ریاحی اور دوسرا اس کا سگریٹری کیپٹن ضرغامی وہ دونوں بری طرح زخمی تھے ان کی حالت ٹھیک نہیں تھی اور مجمع کے ہاتھوں رہائی پانے کے بعد زمین پر بیٹھے بری طرح سے ہانپ رہے تھے۔ جو لوگ ان دونوں کو گرفتار کرکے لائے تھے ان میں سے ایک نے میرزا سے کہا: اس کو ٹینک سے نکال کر گرفتار کیا ہے یہ ٹینک لئے "فوزیہ چوک" تک چلا آیا تھا۔ میرزا نے جنرل ریاحی کی جانب مسکرا کر دیکھا جس کا رنگ بالکل اڑا ہوا اور پورا جسم خوف کے باعث لرز رہا تھا۔ اس کی آنکھیں التجا اور رحم کی بھیک مانگ رہی تھیں یہ وہی سردار تھا جس کی فرمانروائی میں فوج شہر کے مختلف حصوں میں عوام کا خون بہانے میں

مصروف تھی اور اس وقت ذلت ورسوائی کا نمونہ بنا رحم کی بھیک مانگ رہا تھا۔ میرزا نے توحیدی صف کے دو مسلح افراد کو مامور کیا کہ ان دونوں کو مدرسہ رفاہ جو اسیروں کے لئے عارضی قید خانہ تھا پہنچادیں۔ عجیب رات تھی لوگ ہر تھوڑی دیر بعد کسی نہ کسی بڑے افسر کو قیدی بنا کر مدرسہ رفاہ پہنچا رہے تھے۔ یہاں تک کہ گرفتاری نے انقلابیوں میں نئے جوش اور خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔؛ کیپٹن معتمدی کو جب تک مدرسہ رفاہ نہ پہنچا دیا گیا اس وقت تک اسے یقین ہی نہیں ہو رہا تھا کہ وہ انقلابیوں کے ہاتھوں قیدی بنایا گیا ہے۔ چنانچہ جن جوانوں نے اسے گرفتار کر کے آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی ان پر وہ اپنی زبان سے مغلظات انڈیل رہا تھا۔ مدرسہ رفاہ کا بڑا ہال عارضی طور پر قید خانہ بنایا گیا تھا۔ جس میں اب تک شاہی حکومت اور اس کی فوج کے متعدد بڑے افسر قید کئے جا چکے تھے۔ جو بھی اس ہال میں اندر ڈھکیلا جاتا وہاں اپنے ساتھیوں کو پہلے سے موجود پا کر مزید ناامید اور خوفزدہ ہو جاتا۔ گرفتاری کے اس سلسلہ کا سب سے ہیجانی لمحہ تو وہ تھا جب لوگ جنرل رحیمی اور اس کے نائب کیپٹن نوری کو گرفتار کر کے لائے تھے۔ یقیناً جنرل رحیمی جرأت وہمت کے میدان میں کسی سے کم نہ تھا، گرفتاری سے ٹھیک پہلے تک وائرلیس پر فوج کو کنٹرول کر رہا تھا۔ اس نے ایک معمولی کانسٹیبل کی وضع بنا رکھی تھی اس پر لوگوں کی نگاہ تو اس وقت پڑی جب وہ ٹینک میں پناہ لینا چاہتا تھا اور خود اسی کے ایک سپاہی نے جو اس کے ہمراہ تھا چلا چلا کر کہنا شروع کر دیا کہ پکڑو! ارے اسے گرفتار کرو یہ جنرل رحیمی ہے، تہران فوج کا سربراہ۔

یہ سننا تھا کہ مجمع نے رحیمی کو لات اور گھونسوں پر لے لیا اور جب وہ بے ہوش ہو گیا تو اسے مدرسہ رفاہ پہنچا آئے۔ میرزا نے اسے دیکھا زخمی حالت میں گرفتار کئے جانے کے باوجود بھی اس کے چہرے پر نخوت و غرور کا کالا رنگ موجود تھا۔ وہ اپنے اطراف کے لوگوں پر حقارت سے نگاہ ڈال رہا تھا اور ایک خبر نگار نے جب اس سے پوچھا کہ آیا اب بھی وہ شاہ کا حامی و وفادار ہے ؟ تو خود اعتمادی سے بھرے بڑے مضبوط لہجے میں بولا: مجھے یقین ہے کہ ہم کامیاب ہوں گے یہ تماشے تو بس کچھ دنوں کی بات ہیں۔

میرزا یہ دیکھ کر سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ آخر اس اعتماد کی بنیاد کیا ہے ؟ اپنی کامیابی کی بات کسی بنا پر کہہ رہا ہے۔

جس وقت ت جنرل رحیمی مدرسہ رفاہ کے عارضی قید خانے میں داخل ہوا تو فوج اور گارڈ جاودان کے بڑوں کو وہاں دیکھ کر دنگ رہ گیا لیکن فوراً ہی خود پر قابو پاتے ہوئے بغیر کچھ بولے کیپٹن معتمدی کے پاس بیٹھ گیا اور سرگوشی کے انداز میں کہا: طے یہ ہوا تھا کہ آپ قزوین کی بکتر بند ریجیمنٹ کے ساتھ تہران پہنچے نہ اس طرح تن و تنہا اور ہاتھ بندھوا کر۔

آپ نے تمام پہلوؤں پر نظر رکھی تھی سوائے عوامی ارادے کے۔

۲۱اور ۲۲ بہمن کے دن "امام خمینی کمیٹی" کے آرام کے دن نہ تھے۔ انہوں نے شہر تہران اور ملک کے دوسرے حصوں کے حالات پر پوری نگاہ رکھتی تھی۔ فوج کے سربراہ کی گرفتاری سے واضح ہو گیا تھا کہ شہر پر اب عوام کا قبضہ ہے۔ ۲۲ بہمن کی فائرنگ کی آوازیں آنا تقریباً ختم ہو چکی تھیں۔ شہر کے چند علاقوں کو چھوڑ کر بقیہ شہر میں امن و امان قائم ہو گیا تھا۔ لوگ سڑکوں پر موجود تھے اور انکا جوش و ولولہ کے ساتھ صرف نعروں کے بیچ اظہار ہو رہا تھا۔ "آریامہر سڑک" کے آخری سرے پر موجود "جمشیدیہ" چھاؤنی کو لوگوں نے گھیر رکھا تھا اور اندر داخل ہونے کی مسلسل کوشش کی جارہی تھی۔ انجینئر بازرگان کئی مرتبہ لوگوں سے نظم و ضبط بنائے رکھنے کی اپیل کر چکا تھا۔ اس نے لوگوں سے کہا کہ قیدیوں کو امام خمینی کمیٹی کے حوالے کر دیں۔ چھاؤنی کے اطراف لوگوں کا دائرہ دھیرے دھیرے تنگ ہوتا چلا گیا پھر ذرا سے مقابلے کہ بعد لوگ اندر گھستے چلے گئے۔

یہاں حکومت کے بڑے عہدہ داروں کی ایک بڑی تعداد تھی جو "بختیار" کے سیاسی کھیل کا ایک حصہ تھے۔ مجمع نے اندر داخل ہو کر چاروں طرف سے ان افسروں کی اقامت گاہ پر حملہ کر دیا اور ایک ایک کر کے ان تمام افراد کو ان کے ظاہری قید خانے جو دراصل ان کا عیش کدہ تھا سے باہر نکالا۔ انسپکٹر نصیری جو پچھلے ۱۳/ سال سے حکومت کی خفیہ ایجنسی کا سربراہ تھا اور متعدد انقلابیوں کے خون سے ہاتھ رنگے ہوئے تھا اپنی بلند قامتی کی بنیاد پر سب سے زیادہ توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ پہلا گھونسا جو اس کے چہرے پر پڑا تو

اس کے ستارے ناچ گئے، دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر زمین پر بیٹھ گیا۔ اذیت رسانی کا ماہر اور شایق لوگوں میں گھر کر بری طرح کانپ رہا تھا۔ رحم کی بھیک مانگنے پر مزید لات گھونسوں سے اس کی نوازش شروع ہو گئی۔ ایک مسلح جوان نے لوگوں کے درمیان سے بڑی مشکلوں سے اسے باہر کھینچا اور بلند آواز میں چیخا، آپ لوگوں کو حق نہیں ہے کہ اسے مار ڈالیں۔ ان لوگوں کا فیصلہ انقلابی عدالت کرے گی!

چھاؤنی کے ایک دوسرے حصے میں لوگوں نے دس افراد کو ہاتھ پیر سے باندھ کر کھینچتے ہوئے چھاؤنی سے باہر نکالا ان میں شہر تہران کا میئر (Meyer) "نیک پی" اور مشہور سینٹر "ڈاکٹر آز مون" منصور روحانی اور ممبر پارلیمنٹ "کیپٹن جاف" جس نے اپنے خلقہ انتخاب میں عوام کا قتل عام کرایا تھا موجود تھا، قیدیوں کی تعداد تقریباً سو تک جا پہنچی تھی۔ میرزا نے مدرسہ رفاہ کے ایک اور ہال کو قیدیوں کے لئے آمادہ کیا۔ اس بڑی گرفتاری کے بعد "امام خمینی کمیٹی" نے راحت کی سانس لی تھی۔ ملکی اور غیر ملکی خبر نگار قیدیوں سے انٹرویو لے رہے تھے۔

میرزا نے فوج کے بڑے افسروں کو قابو میں کرنے کے لئے مصطفی کا انتخاب کیا تھا۔ وزیر اعظم اور شورائے انقلاب کے اراکین سیاسی مسائل کے حل میں مشغول تھے۔ ان لوگوں کی توجہ اس طرف نہ تھی۔ "ہویدا" کے گرفتار ہونے کے بعد حالات

بالکل بدل گئے۔ جب اسے مدرسہ رفاہ منتقل کیا گیا تو جیسے ہی اس نے پہلے سے موجود قیدیوں کو دیکھا اس کی حالت مزید خراب ہو گئی، تعجب سے گویا اس کی آنکھیں نکلی پڑتی تھیں، کچھ دیر یوں ہی دیکھتا رہ گیا پھر کیپٹن نصیری کے پاس جا کر دھیرے سے بیٹھ گیا۔ کیپٹن نصیری پر ایک نگاہ کی اس کے چہرے اور سر پر پٹیاں بدھی تھیں "ہویدا" نے کہا: ہم کو دھوکا دیا گیا۔ ہم کو ڈھال کی صورت استعمال کیا گیا تا کہ خود وہ لوگ آسانی سے فرار کر سکیں۔ جس وقت حکومت بختار کے حوالے کر دی گئی تھی مجھ میں حکومت کی حمایت کا کوئی جذبہ باقی نہ بچا۔ کیپٹن نصیری جس کا چہرا خوف سے سیاہ ہو رہا تھا بولا: ہم لوگوں کا کام تو اب تمام ہونے والا ہے۔

انجام کار

مدرسہ علوی میں پچھلے کئی دنوں سے شاہ حامی عناصر پر مقدمہ چلانے کی تیار کی جارہی تھی۔ عدالتی کاروائی کے لئے ایک چھوٹا سا ہال منتخب کیا گیا تھا۔ شاہی حکومت کے ان معروف افراد سے پوچھ تاچھ کا سلسلہ تقریباً پچھلے ۴۸ گھنٹوں سے جاری تھا۔ سب کے خلاف مفصل چارشیٹ آمادہ ہو چکی تھی۔ پوچھ تاچھ سے لیکر مقدمہ چلائے جانے کے تمام تمہیدی امور متعدد علماء اور ماہر قانون دان کے زیر نگرانی انجام پذیر ہو رہے تھے۔ ان لوگوں کو اس کام پر امام خمینی نے مامور کیا تھا اور امام خمینی کے حکم کے ہی مطابق ان کی پوری

کوشش تھی کہ مجرمین پر جتنی جلدی ممکن ہوسکے مقدمہ چلایا جائے اور عدالت کی پوری رعایت کرتے ہوئے ان کو جلد از جلد ان کے جرموں کی سزا دے دی جائے۔

میرزا نے سب سے پہلے ان ۲۷ مجرموں کو مذکورہ حال تک پہنچایا جن کے جرم عیاں اور ناقابل تردید تھے۔ پہلی صف میں جنرل نصیری "ہویدا" کرنل س خسرو داد، جنرل رحیمی، کرنل ناجی، کرنل جاف، حاج مہدی معتمدی اور میجر جنرل برنجیان کرسی پر بٹھائے گئے۔ اور بقیہ پچھلی کرسیوں پر بٹھائے گئے۔ ایک پتلے دبلے سفید ریش معمر عالم دین مجرموں کے کرتوتوں کو اونچی آواز میں پڑھ رہے تھے۔ جنایتکاروں کا سکوت ان جرائم پر جن کا وہ پہے ہی اعتراف کرچکے تھے مزید تائید تھا۔ پھر ایک اور عالم دین آگے بڑھے اور انہوں نے ترکی لہجہ میں انقلابی عدالت کا فیصلہ پڑھ کر سنایا، عدالت میں حاج مہدی عراقی اور دوسرے برجستہ افراد موجود تھے۔ عدالت کے جج کی دستخط کے بعد حکم پر آخری مہر لگانے کے لئے حکم نامہ امام خمینیؒ کی خدمت میں بھیج دیا گیا۔ انجینئر بازرگان مجرموں کو پھانسی دے ئے جانے کا مخالف تھا۔ اس نے حاج مہدی سے کہا: امام خمینیؒ سے کہہ دینا کہ ان سب کو پھانسی دے دیا جانا مناسب نہیں ہے۔ اس قدم کا بین الاقوامی سطح پر برا اثر پڑے گا۔ حاج مہدی اس کی رائے کے موافق نہ تھے؛ کہنے لگے: یہ سب جو اس وقت اپنے کو مظلوم ظاہر کررہے ہیں سو سے زائد قتل کا اعتراف کرچکے ہیں۔ اگر یہی دیکھنا تھا کہ

دوسرے کیا کہتے ہیں تو اتنے شہید دینے کی کیا ضرورت تھی؟ انقلاب ہی کی کیا ضرورت تھی؟

حاج مہدی عراقی حکم نامہ پر امام خمینی کی تائید حاصل کرنے کے لئے ان کے کمرے کی طرف چل پڑے۔ انجنیئر بازرگان بھی ان کے ساتھ ہولیا۔ یقیناً اس کا ارادہ تھا کہ اپنی رائے سے امام کو بھی آگاہ کرے۔ مصطفی جو ان دونوں کے درمیان ہونے والی اس چھوٹی سی گفتگو کو بڑے غور سے سن رہے تھے بول پڑے: حضور مجھے اجازت دیجئے میں ایک جھٹکے میں ان ۲۷ کے ۲۷ کو گولیوں سے بھون ڈالوں پھر بعد میں آپ اعلان کر دیجئے گا کہ یہ حرکت ایک دیوانے کی تھی۔ آپ مجھے گرفتار بھی کر لیجئے گا تاکہ بین الاقوامی سطح پر بعض لوگوں کی آبرو رہ جائے۔

حاج مہدی نے آخری جملے سے مصطفی کا طنز بھانپ لیا تھا ایک بار انجنر کی طرف دیکھا اور خاموش رہے۔ انجبر بازرگان نے مصطفی پر ایک عجیب سی نظر ڈالی۔ حاج مہدی بولے آقا کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوگا ہم لوگوں کو اپنے ہوش و حواس سنبھالے رکھنا چاہئے۔

ادھر میرزا نے مجرموں کو ایک بار پھر عارضی قید خانہ کے حوالے کر دیا تھا۔ رات کے دس بجے آخری فیصلہ سنایا جانے والا تھا۔ سب پر اضطراب کی سی کیفیت طاری تھی۔ پورے ہال میں طوفان سے پہلے کا سا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ سبھی کی نگاہیں کمیٹی کے صدر

پر تھی جن کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا۔ صدر جج نے ایک بار ہال میں بیٹھے تمام لوگوں پر ایک نگاہ ڈالی پھر امام خمینی کا تائید شدہ آخری فیصلہ بآواز بلند پڑھ کر سنانے لگے۔ "حکم خداوندی کے مطابق انقلابی عدالت کے فیصلہ اور امام خمینیؒ کے فرمان کے تحت مجرم بریگیڈیر نعمت اللہ نصیری، جنرل رحیمی، کرنل خرداد اور ناجی کو فساد فی الارض کا مجرم مانتے ہوئے موت کی سزا سنائی جاتی ہے۔"

میرزا فیصلہ کا تاثر موجودین پر کیسا رہا دیکھنے کے لئے نہ رکے وہ سیدھے عارضی قید خانے کی جانب چل پڑے تھے اور کچھ منٹوں بعد پھر ہال کی طرف واپس آئے اور اب ان کے ساتھ مذکورہ چاروں مجرم تھے جنہیں میرزا نے ہال میں ایک جانب رکھی ہوئی کرسیوں پر بٹھا دیا۔ پھر جب انہیں عدالت کے آخری فیصلے سے آگاہ کیا گیا تو ان پر عجیب کیفیت طاری ہو گئی تھی چہرہ پر چھائی مردنی گواہ تھی کہ انہیں اپنی موت سامنے کھڑی نظر آنے لگی تھی۔

بقیہ ۲۲ مجرموں کا فیصلہ نہیں سنایا گیا تھا۔ حاضرین اس مسئلہ کی گتھی سلجھانے کی فکر میں تھے بہر حال پہلے مرحلہ میں انقلابی عدالت نے ان چار مجرموں کو موت کی سزا سنائی تھی جو واقعاً عوام کے قتل عام میں سر فہرست تھے۔

میرزا نے فیصلہ کے مطابق مجرموں کو گولی سے مار دینے کے انتظامات شروع کر دئے تھے انہوں نے صدر جج سے اس کا اجازت نامہ لے کر محسن کے حوالے کر دیا تھا۔ نصیری پر سکتہ طاری تھا گویا وہ ساواک کی صدارت کے اپنے پچھلے کئی برس یاد کر رہا تھا اسے شاید وہ تمام ایذار سانی یاد آرہی تھیں جو اس کے حکم سے انقلابی قیدیوں کو دی جاتی تھیں۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے لیکن یہ قطعاً ندامت کے آنسو نہ تھے بلکہ موت کے خوف سے وہ کسی سحر زدہ خاموش بچے کی طرح رو رہا تھا۔ میرزا نے اس کی طرف غور سے دیکھا میرزا کو اس کی آنکھوں میں اب بھی درندگی نظر آرہی تھی یقیناً ایسے سفاک کا دل جس نے پچھلے کئی برس صرف اذیت دینے کے کئی نئے طریقے ایجاد کئے تھے کبھی نرم نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ ایک وحشتناک کہانی کا اختتام تھا۔ ایک ایسے ظالم کا انجام جس نے پچھلے ۱۴ برس میں حجاج و سفاح جیسے بے رحموں کو بھی شرمندہ کیا دیا تھا۔ شاہ سے نزدیکی رابطہ ہونے کی بناپر اس کے کسی بھی فعل پر کسی کو کوئی اعتراض کا حق تھا نہ جرائت۔ جس وقت وہ پورے ملک کی پولیس کا ہیڈ تھا اسمگلنگ اور کالا بازاری کے بڑے بڑے ایجنٹوں سے اس کے خاص روابط تھے جس کی بناپر اس نے افسانوی دولت اکٹھا کر رکھی تھی۔

میرزا کی نگاہ جنرل رحیمی پر پڑی وہ اپنی خراب حالت پر اب بھی اکڑ اور غرور کا جھوٹا لبادہ ڈالے ہوئے تھا۔ میرزا نے اس سے توبہ کرنے کو کہا تو اس نے کہا: میں ہمیشہ

ملک اور قانون کا وفادار رہوں گا کیونکہ میں حکومت شاہنشاہی کا جانثار ہوں اور اس ملک کی شرافت و عزت کے لئے ہر قربانی دینے کے لئے آمادہ ہوں! گویا اسے ابھی بھی بچ جانے کی امید تھی یہ وہی شخص تھا جس نے تہران کی سڑکوں پر سرعام گولی چلانے کا حکم دیا تھا۔ ملک کی فوجی قوت کی سربراہی اور شاہ کا عطا کردہ نشان لیاقت اور مختلف عناوین کا نشہ تھا جو ابھی اس کے سر سے نہیں اترا تھا۔

کرنل ناجی تو گڑ گڑائے جا رہا تھا۔۔۔۔ دوہرے بدن والا اور درشت لہجہ کا مالک یہی وہ کرنل تھا جس نے اصفہان میں قتل عام کا حکم دیا تھا۔ نجف آباد اصفہان کے ہولناک حادثہ کا ذمہ دار بھی سیدھے سیدھے یہی شخص تھا جس سے وہ کسی طرح بھی انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اس وقت رہائی کے لئے اس کی معافی اور رحم کی بھیک مانگنا جال میں پھنسی کسی بوڑھی لومڑی مکاری سے کم نہ تھا جو آخری وقت تک جان بچانے کے لئے مختلف چالیں چلتی ہے۔

میرزا کے نگاہ خسرو داد کے چہرہ پر چھائی مردنی پڑی انہیں وہ زمانہ یاد آگیا جب وہ شاہ کے نزدیکیوں میں سے تھا اور اس کی سفاکیت شہرہ عام رکھتی تھی۔ عدالت میں خسرو داد نے جو اعترافات اور انکشافات کئے وہ یقیناً سننے کے لائق تھے۔ اس نے بتایا کہ شاہ کے فرار کے بعد اس کی کوشش تھی کہ اپنی مخصوص فوج کے ذریعہ شہر تہران کو اپنے قبضے

میں لے لے اور "بختیار" کو ہٹا کر پورے ملک کا بادشاہ بن بیٹھے اور ۲۲/ بھمن کی شببر یگیڈیر "بدرہ ای" جنرل رحیمی، میجر جنرل ربیعی اور دیگر جنبرلوں کے ساتھ مل کر انقلاب کو کچلنے کا جو منصوبہ بنایا تھا اس میں خسرو داد کی ذمہ داری یہ تھی کہ تہران کے حساس علاقوں میں پیراشوٹ کے ذریعہ فوجیوں کو اتارا جائے خاص طور پر مدرسہ علوی کے اطراف میں جن کا کام امام خمینی اور ان کے تمام ساتھیوں کا کام تمام کرنا تھا۔

میرزا نے مصطفی کی ہمراہی میں عدالتی حکم کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ان چاروں کو اپنی تحویل میں لے لئے۔ رسمی کاروائی ہو جانے کے بعد میرزا نے ہر ایک کے پیچھے ایک مسلح سپاہی کو مامور کیا۔ محسن شکوری، روح اللہ اور اکبر نہایت چابکدستی سے ایک ایک مجرم کو سنبھالے ہوئے تھے۔ عدالتی ہال سے باہر لا کے میرزا نے ان سب کی آنکھوں پر پٹیاں باندھ دی اور پھر انہیں لئے ہوئے مدرسہ علوی کی چھت پر چل پڑے۔ اندھیرے میں بھی "نصیری" اور "ناجی" کے بدن کی کپکپاہٹ محسوس کی جارہی تھی۔ "نصیری" پر ایسا خوف طاری تھا کہ وہ چل نہیں پارہا تھا مصطفےٰ نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑا اور اسے سیڑھی پر اوپر چڑھنے میں مدد کرنے لگے۔ نصیری نے کانپتی ہوئی نحیف آواز کے ساتھ پوچھا ہمیں کہاں لے جایا جارہا ہے۔

اپنے آپ کو مرنے کے لئے تیار کر لو۔ یہ سنتے ہی اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ یہ قافلہ جب چھت پر پہنچا تو وہاں کچھ خبر نگار پہلے ہی سے موجود تھے اور چند دیگر افراد بھی انقلابی عدالت کے صادر شدہ پھانسی کے پہلے حکم کو عملی جامہ پہنتے ہوئے دیکھنے کے لئے موجود تھے۔

شہر تہران پر سناٹا چھایا ہوا تھا میرزا نے چاروں کو دیوار کی طرف رخ کر کے صف بستہ کھڑا کر دیا۔ چند جوان ہاتھوں میں بندوقیں تھامے آگے بڑھے۔ مصطفےٰ نے ان کی جانب دیکھا اور بلند آواز میں بولے۔

ان مجرموں کو اسلامی انقلاب کی عدالت نے موت کی سزا سنائی ہے۔ اگر کوئی شخص بغض یا ذاتی مقصد کے تحت ان کی جانب فایر کرے گا تو وہ قاتل شمار کیا جائے گا۔ حکم، خدا کا حکم ہے ہماری نظر میں فقط اور فقط مرضی خدا ہونی چاہئے۔ یہ سنتے ہی بندوق کی نلیاں نیچے ہو گئیں۔ پھر میرزا نے چار افراد کو مامور کیا۔ وہ اپنی اپنی بندوقیں سنبھالے آگے بڑھے۔ مصطفےٰ نے ایک بار پھر مجرموں کے کرتوت اور عدالتی فیصلہ پڑھ کر سنایا۔ سبھی کی نگاہیں مجرموں کی جانب تھی سناٹا چھایا ہوا تھا کہ مصطفےٰ کی بلند آواز گونجی۔ فایر۔

فائر کی آواز شہر تہران پر چھائے سناٹے کو دور تک چیرتی ہوئی چلی گئی۔ایک لحظہ کے لئے موجودین پر بھی چھت پر پڑی چار لاشوں کی طرح سکوت طاری تھا پھر اللہ اکبر کی آوازیں بلند ہونے لگی۔

میرزا آگے بڑھے اور چاروں لاش کا مشاہدہ کیا اور ان کی موت سے مطمئن ہونے کے بعد نہ جانے کیوں آسمان پر پھیلے ان گنت ستاروں کو دیکھنے لگے۔ شاید میرزا اپنی گزشتہ زندگی کے صفحات پلٹ رہے تھے۔انہیں وہ دن بخوبی یاد تھا جب امام خمینی کے ایک بیان کو پڑھ کر ان کی زندگی کے تمام پیمانے ہی بدل گئے تھے۔آج ان کی زندگی کے ۲۴/ برس گزر چکے تھے جن کے پچھلے آٹھ سال میں ان کی شخصیت بدل کر رہ گئی تھی۔آٹھ برس پہلے والے آزاد منش محمد بروجردی کہاں اور ذمہ داریوں کے کوہ گراں کو سنبھالنے والے میرزا کہاں۔ لیکن ان گذشتہ برسوں میں میرزا اتنے فکر مند نہ رہے ہوں گے جتنا آج انقلاب کی کامیابی کے بعد آئندہ سے متعلق فکر مند تھے۔11 فروری کو فوج کے افسروں نے قوم کے سامنے اسلحہ ڈالنے کا اعلان کر دیا۔ ان کی گرفتاری کے ساتھ ہی انقلاب کی کامیابی کا ڈنکا بج گیا۔ اور جشن آزادی کا آغاز ہو گیا۔ عوام یک صدا تھی اور انقلاب کی راہ میں شہید ہوئے لوگوں کے نام پر نعرے بلند ہو رہے تھے۔

انقلاب مخالف عناصر سے جہاد

میرزا کی ذمہ داری ابھی بھی سخت تھی وہ اب بھی مدرسہ علوی میں حفاظتی ٹیم کی سربراہی کر رہے تھے۔ امام سے ملاقات کرنے کے لئے پورے ملک سے لوگ جوق در جوق چلے آرہے تھے "انقلاب اسلامی عدالت" کی تشکیل دی گئی۔ جس میں شاہی حکومت کے بڑوں پر ایک ایک کر کے مقدمہ چلایا جارہا تھا۔ جن کے ہاتھ عوام کے خون سے رنگے پائے جاتے پھانسی کا پھندا ان کے گلے پر کس دیا جاتا مجرموں کی رکھوالی بھی ایک مسئلہ تھی "اون جیل" کی ذمہ داری بھی میرزا کے حصے میں آئی۔ میرزا اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ مل کر ایک عوامی فوج کی تشکیل میں بھی مصروف تھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ ایک مضبوط منظم فوج بنا کر انقلاب کی حفاظت اس کے سپرد کر دیں۔

"پاسدارن انقلاب" نامی اس فوج کے ذریعہ اسلامی انقلاب کی مکمل حفاظت کا سامان ہونا تھا امام خمینی کے قم چلے جانے سے میرزا کو پورا وقت مل گیا تھا کہ وہ "پاسداران انقلاب" کی تشکیل کے لئے ہر ضروری کام تیزی سے انجام دے سکیں۔ تہران میں واقع عشرت آباد نامی چھاؤنی جس کا نیا نام اب امام عصر کے نام پر رکھا گیا تھا۔ "پاسداران انقلاب" کی پہلی چھاؤنی بنی تھی۔ میرزا کی رہبری میں پاسدارن انقلاب کا پہلا کام شر پسندوں اور انقلاب مخالف سرگرمیوں میں ملوث لوگوں کو گرفتار کر کے ان پر مقدمہ چلانا اور انہیں ان کے انجام تک پہونچانا تھا۔

سب سے پہلے صحرائے ترکمن میں "کمنسٹ" کے نام پر بغاوت کا پرچم بلند کیا گیا۔ جس کی اصلی پشت پناہی استکبار کر رہا تھا۔ میرزا نے اس بغاوت کو کچلنے میں بڑا کردار ادا کیا۔ اس کے بعد کردستان میں انقلاب کے خلاف آوازیں بلند ہونا شروع ہوئیں۔ امریکہ اور اسرائیل کھلے عام جسکی حمایت کر رہے تھے۔ شاہ امریکہ میں تھا اور ملک میں افراتفری پھیلا کر دوبارہ حکومت حاصل کرنے کی فکر میں تھا۔ میرزا اور ان کی فوج حالات پر پوری طرح قابض تھے لیکن دشمن بھی کم طاقتور نہ تھا اور عام آدمیوں کے لباس میں کہیں بھی دشمن کے عناصر آمد ورفت کرتے ان کا پہچانا جانا سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ ان لوگوں نے ایران کے مغربی صوبہ کو اسی لئے اپنی سرگرمیوں کا مرکز قرار دیا تھا تاکہ عراق کی سرحدوں سے بڑی آسانی کے ساتھ اسلحے حاصل کر سکیں۔ ہر دن کردستان نے دردناک واقعات کی خبریں آتیں انقلابی پولیس اور فوجیوں کے سر کاٹ دینا انقلاب مخالف عناصر کا سب سے چھوٹا جرم تھا جو وہ روزآنہ انجام دیتے تھے۔ وہ لوگ کردستان کو ایران سے جدا کر کے ایک مستقل ملک بنانے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ سال ۱۳۵۸، ش۔ھ۔ میں "پاوہ" شہر میں انقلاب مخالفوں کا حملہ اسلامی حکومت کو بہت بڑا چیلنج تھا۔ یہ حملہ امریکہ اور عراق کی پشت پناہی میں باغیوں کی تیزی سے بڑھتی ہوئی طاقت کا پتہ دے رہا تھا۔ نزدیک تھا کہ شہر پاوہ پر باغیوں کا قبضہ ہو جائے لیکن آخری وقت میں داکٹر چمران ہیلی کاپٹر کے ذریعہ وہاں پہونچے۔ صرف سپاہ کا ہیڈ کواٹر اور انکا اسپتال ہی اسلامی فوج کے ہاتھ

میں رہ گیا تھا۔اور باغیوں اوران کی مکمل فتح کے درمیان اسپتال پر موجود یہی حسینی پاسدار رہ گئے تھے پاوہ شہر کاہاتھ سے نکل جانا قطعی لگ رہاتھا۔ یہ خبر امام تک پہونچی۔امام نے فوج اور سپاہ کو سخت لہجہ میں پورے فوجی ساز وسامان کے ساتھ کردستان کوچ کرنے کا حکم دیا۔ میرزانے جب یہ خبر سنی وہ اپنے گھر میں تھے فوراًہی چھاؤنی پہونچے اوراپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ سپاہ اور ارتش کی ہمراہی میں پاوہ کی طرف چل پڑے۔امام خمینی کے اعلان کو سن کر رضاکارانہ طور پر لوگوں کا ہجوم 'پاوہ' کی طرف چل پڑااور اسی رات فوج اور سپاہ کے ساتھ ساتھ "بسیجیوں" نے پورے شہر پر قبضہ کر لیا باغیوں کے خلاف بڑے پیمانے پر منصوبہ بند پورے کردستان صوبے میں باغیوں کے تمام ٹھکانوں پر حملہ شروع کردیا۔اس کام میں عام لوگ بڑھ چڑھ کران کا ساتھ دے رہے تھے۔ ساتھ ہی بقیہ علاقوں کو بھی اسی رات سپاہ نے باغیوں کے قبضہ سے نکال لیا تھا۔ ملک کو بانٹ دینے کی یہ ایک بڑی سازش تھی جو امام خمینی کی تدبیر اور فوج اور عوام کی زحمتوں سے ناکام بنادی گئی۔

میرزا اچھی طرح جانتے تھے کہ انقلاب مخالف عناصر شرارتوں سے ہر گز باز نہ آئیں گے لہٰذا انہوں نے کردستان میں ہی کچھ دنوں تک رکے رہنے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے مغربی ایران میں سپاہ کے سربراہ کی حیثیت سے "باختران" شہر کو اپنا ہیڈ کواٹر بنایا تاکہ عوام اور "سپاہ" کی مشترکہ فوج کو منظم کرکے کردستان کو انقلاب مخالف عناصر سے پوری طرح آزاد کرا سکیں۔

مسیحا "کردستان" میں

میرزا نے 1979 کی گرمیوں سے لے کر 1983 تک یعنی اپنی عمر کے تقریباً چار سال کردستان کے مسائل حل کرنے میں صرف کئے۔ یہ عرصہ نہ صرف انکے لئے بھاری مشقتوں کا حامل تھا بلکہ خود انقلاب اسلامی کی تاریخ کا یہ سب سے زیادہ حساس اور بڑی دشواریوں کا زمانہ تھا۔ اس بات سے کم ہی لوگ واقف ہیں کہ کردستان کی آزادی اور وہاں سے ضدانقلابیوں کی جڑیں نکال کر میرزا نے ملک کے استقلال اور آزادی کو کتنی تقویت بخشی۔ میرزا کی زحمتوں کے یہ چار سال ایک طرف اور انکی بقیہ جفاکش زندگی ایک طرف۔

ان ایام میں میرزا نے بڑی مشقتیں اٹھائیں تب جاکر اپنے ملک کی ایک ایک بالشت زمین دشمنوں کے قبضہ سے واپس چھین کر ملک کے استقلال کو استحکام بخشا اور انقلاب کو ان کے شر سے محفوظ کر دیا۔ میرزا کی سوانح حیات میں مذکورہ ایام کا تذکرہ سب سے زیادہ ہے جس کے غائرانہ مطالعہ سے ہی واقعہ کے تمام پہلوؤں سے واقفیت حاصل کی جاسکتی ہے۔ ہم میں سے اکثر لوگ جانتے ہیں کہ دشمن سے آمنے سامنے کی جنگ، چھاپامار جنگ سے بہت آسان ہوتی ہے۔ میرزا کردستان کے سیاسی حالات اور وہاں کے جغرافیائی تقاضوں کے تحت معرکہ کے پورے چار سال چھاپامار جنگ میں مشغول رہے۔ ظاہری طور پر دشمن کے پاس نہ کوئی کمین گاہ تھا اور نہ مشخص محاذ۔ دشمن عوام کو ڈھال بنائے

انہیں میں گھلے ملے رہتے۔ اس طرح وہ پورے علاقہ میں پھیلے ہوئے تھے۔ مذکورہ ایام میں ان کی سعی اور مزاحمت بہت بڑھی ہوئی تھی۔

میرزا نے 1979 میں ہی باختران سے اپنی مہم کا آغاز کیا۔ ان کا پہلا قدم لشکر اور باقاعدہ فوجی ساز و سامان کا جمع کرنا تھا۔ جنگ کے لئے ملک بھر سے رضاکارانہ طور پر جمع ہونے والے افراد میرزا کے منصوبوں کے لئے کافی نہیں تھے۔ اس لئے انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ خود کردستان کے گلی کوچوں سے نوجوانوں کو اکٹھا کر کے ایک مقامی فوج بھی تشکیل دی جائے۔ میرزا کا پہلا ہدف یہ تھا کہ مسلم کرد عوام کا حساب ضد انقلابیوں سے جدا کیا جائے۔ میرزا دیکھ رہے تھے کہ روزآنہ نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد فوجی کیمپ کی طرف رجوع کرتی ہے تاکہ فوج میں شامل ہو کر ضد انقلاب عناصر سے جنگ کرے۔

کردی عوام سے تشکیل یافتہ ایک فوجی تنظیم بنانے کی فکر نے اس وقت اور تقویت پائی جب حکومت وقت نے "حُسن نیت" نامی ایک وفد ضد انقلابیوں کے ساتھ بات چیت کرنے کے لئے کردستان بھیجا۔ مقصد یہ تھا کہ مذاکرات کے ذریعہ ہنگامے کو فی الحال خاموش کیا جائے اس کے لئے فوج اور "سپاہ" کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنے اپنے ٹھکانوں پر واپس آجائیں اور کردستان کے معاملات میں کسی قسم کی مداخلت نہ کریں۔ میرزا پہلے سے ہی اچھی طرح آگاہ تھے کہ یہ ضد انقلابیوں کی سازش ہے، یہ لوگ یہی چاہتے ہیں کہ مذاکرات اور صلح کے بہانے سپاہ اور فوج کردستان نے نکل جائے اور وہ لوگ آسانی سے حالات پر دوبارہ تسلط قائم کر سکیں۔ میرزا کا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا فوج اور سپاہ نے جیسے ہی کردستان چھوڑا پورے شہر میں بلکہ کردستان کے دیہی علاقوں پر بھی ضد انقلاب عناصر نے مسلحانہ قبضہ کر لیا۔ ساتھ ہی یہ لوگ صوبہ باختران اور مغربی آذر بائیجان کے

بعض علاقوں پر بھی قابض ہو گئے۔اور در حقیقت کردستان کو ضد انقلابیوں کے تسلط سے آزاد کرانے کے لئے شہید چمران اور دیگر انقلابی سپاہیوں کی عظیم زحمتیں رائگاں ہو گئیں۔اور کام دوبارہ سے شروع ہو گیا۔انہیں مسائل کے مد نظر میر زانے فیصلہ کیا کہ خود کردستانی عوام سے ایک چھوٹی سی فوج تشکیل دی جائے۔ جسکا نام انہوں نے "سازمان پیش مرگان مسلمان کرد" رکھا۔اس چھوٹی سی عسکری تنظیم نے آگے چل کر "سپاہ" کی ہمراہی میں بہت مؤثر قدم اٹھائے۔میر زانے اسی گروہ کی مدد سے "کامیاران" شہر کو آزاد کرالیا جو کوملہ گروہ کا مرکز تھا۔ "کامیران" کی آزادی میر زا کے لئے آئندہ کی بڑی کامیابیوں کے لئے پہلا زینہ ثابت ہوئی۔ میر زا "نجات دہندہ اور کردستان کا مسیحا" جیسے لقب سے یاد کئے جانے لگے۔انہیں یہ لقب محض ان کی عسکری فتوحات کی بناپر نہیں ملا تھا بلکہ ان کی نیک نیتی، بہترین اخلاق اور جلد ہی گھل مل جانے والا مزاج اسکا باعث بنا تھا۔ پورا علاقہ ان کے بلند اخلاق، پاکیزہ کردار، عزم وہمت ہنس مکھ مزاجی اور وظائف کے تیئں ان کی سنجیدگی کا دلدادہ تھا۔ میر زا سے درخواست کی گئی کہ تہران واپس آکر "سپاہ" کی سربراہی کا عہدہ سنبھال لیں۔ لیکن انہوں نے اس پیش کش کو قبول نہیں کیااور کردستان میں رہ کر ہی مقامی فوج کی کمان سنبھالے رہنے کو ترجیح دی۔ کردی عوام سے روز بروزان کے تعلقات گہرے ہوتے چلے گئے۔ان سے میر زا کو جو دلی لگاؤ پیدا ہو گیا تھا اسی بناپر میر زا نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ علاقہ کو پوری طرح آزاد کرانے کے ساتھ ساتھ وہاں کی ترقی اور آبادکاری کے لئے پوری کوشش کریں گے۔ میر زانے ضد انقلابیوں کے ساتھ ساتھ علاقہ سے جہالت اور فقر و غربت کو بھی باہر نکالنے کے لئے جدوجہد شروع کردی۔ میر زانے باختران میں اپنے قیام کے چند ماہ بعد یعنی 1977 کے اسفند ماہ میں اپنے خاندان کو بھی

وہیں بلالیا یہ اسی وقت کی بات ہے جب میرزا کے گھر دوسری اولاد کی شکل میں 'سمیہ' نے آنکھیں کھولی تھیں۔

میرزا "سپاہ" کے دو جوانوں کے ہمراہ سندج سے باختران جارہے تھے۔ راستہ میں بھیڑ تھی سبھی گاڑیاں غروب سے پہلے اپنی منزل تک جلد از جلد پہنچنا چاہ رہی تھیں۔ میرزا اوران کے ساتھی سادہ لباس میں تھے۔ گاڑی میرزا چلارہے تھے۔ ان کی رفتار زیادہ نہیں تھی۔ عقب سے ایک ٹرک آگے نکل جانا چاہتا تھا۔ اسکا ڈرائیور بار بار ہارن بجارہا تھا۔ میرزا کی کوشش یہ تھی کہ گاڑی کو سڑک کی داہنی جانب اتار دیں تاکہ ٹرک آگے نکل سکے لیکن سامنے سے آنے والی گاڑیاں موقع نہیں دے رہی تھیں ادھر ٹرک والا کئی مرتبہ تیز رفتاری کے ساتھ آگے نکل جانے کی ناکام کوشش کرچکا تھا۔ اب وہ غصہ میں لگاتار ہارن بجارہا تھا ساتھ ہی ٹرک کی اگلی روشنی کو جلا بجھا رہا تھا۔ میرزا پوری کوشش کررہے تھے کہ ٹرک کو آگے نکل جانے دیں لیکن کامیاب نہ ہوسکے تھے۔ لیکن آخر کار کافی جدوجہد کے بعد ٹرک کو آگے نکل جانے کا موقع مل گیا لیکن آگے نکلتے ہی ٹرک میرزا کی گاڑی کے ٹھیک سامنے آکر اچانک ہی رک گیا میرزا نے بھی بریک پر اپنی ساری قوت صرف کردی ورنہ شاید ان کی گاڑی ٹرک سے ٹکرا ہی جاتی۔ ساتھ ہی ٹرک ڈرائیور ٹرک پر سے کود پڑا وہ ایک قوی جسامت کا مالک تھا دہانے کو ڈھانک لینے والی اسکی موٹی مونچھوں نے اس کے چہرہ پر کرختگی پیدا کررکھی تھی۔ وہ غصہ میں بھرا ہوا میرزا کی گاڑی کی طرف لپکا اور دروازہ کھول کر میرزا کو گاڑی پر سے گھسیٹ لیا اسکے منھ سے مغلظات کا طوفان امڈ رہا تھا۔ اس نے میرزا کو گریبان سے پکڑ کر باہر نکالا اور جب تک میرزا کچھ کہتے سمجھتے وہ ایک ہاتھ جھاڑ چکا تھا۔ یہ دیکھ کر میرزا کے ساتھیوں نے ٹرک ڈرائیور پر حملہ کرنا چاہا لیکن میرزا نے انہیں

روک دیااور ڈرائیور سے کہا! ہمیں معاف کرنا ہم سے غلطی ہو گئی۔ ڈرائیور کا غصہ پوری طرح ٹھنڈا نہیں ہوا تھا وہ گالیاں بکتا ہوا اپنے ٹرک کی طرف پلٹ گیا۔ ایک سپاہی نے اس پر حملہ کرنا چاہا وہ چاہتا تھا کہ ڈرائیور سے کہے! اے بے ادب ناہنجار کیا تم جانتے ہو کہ تم نے کس پر ہاتھ اٹھایا ہے؟ لیکن میرزا نے اسے روکتے ہوئے کہا! ارے کوئی بات نہیں یہ خدا کا بندہ، ڈرائیور ہے۔ ایک زحمت کش مزدور گاڑی چلانا ایک تھکا دینے والا کام ہے۔ اب کچھ کہہ گیا، غصہ میں تھا جانے دو، خدا اس بات سے راضی نہ ہوگا کہ اب ہم اسے اور زیادہ پریشان کریں۔ تینوں گاڑی پر دوبارہ سوار ہوئے درحالانکہ میرزا کے ہمراہی اس واقعہ سے بہت آزردہ تھے وہ بے چینی کے ساتھ ٹرک کو دور ہوتا دیکھتے رہے۔

اسی رات باختران میں واقع "سپاہ" کے اردوگاہ میں میرزا اپنے دفتر میں بیٹھے کسی کام میں مشغول تھے۔ تبھی باہر سے کچھ آوازیں آنے لگیں۔ میرزا نے وہاں موجود ایک سپاہی سے کہا دیکھو باہر کیسا شور ہے۔ سپاہی دفتر سے باہر نکل گیا کچھ ہی دیر میں واپس پلٹ آیا اس نے اطلاع دی کہ ایک ٹرک ڈرائیور سندج سے آیا ہے وہ سامان کو ابھی اتروانا چاہتا ہے، بہت جلدی میں ہے کہہ رہا ہے ٹرک کو فوراً خالی کر دیا جائے کیونکہ وہ فوراً واپس جانا چاہتا ہے۔ میرزا نے کہا اسے یہیں لے آؤ، ڈرائیور کو دفتر میں لایا گیا درحالانکہ وہ اب بھی غصہ میں تھا اور اول فول بکے جا رہا تھا۔ میرزا سپاہ کی وردی میں ملبوس اپنی کرسی پر سر جھکائے کاغذات میں مشغول تھے۔ ڈریئور کے پہنچنے پر سر اٹھا کر دیکھا مسکرا کے کہنے لگے! کیا بات ہے دوست تم پھر شور غل مچا رہے ہو؟ ڈرائیور دروازہ پر ہی ٹھٹک کر رہ گیا تھا کچھ بول ہی نہ سکا گویا گونگا ہو۔ اسے یقین ہی نہیں ہو رہا تھا کہ سپاہ کے اتنے بڑے عہدہ پر فائز یہ وہی جوان ہے جسے اس نے کچھ گھنٹوں پہلے مارا اور گالیاں بکی تھیں۔ وہ ہاتھ جوڑ کر بری

طرح معذرت طلب کرنے لگا ندامت و پشیمانی اور خوف و حراس کے ملے جلے آثار نے اس کے پورے وجود کو ڈھانپ لیا تھا۔ میرزا بولے ! "ارے اسے بھول جاؤ یہ بتاؤ ابھی تمہارا کیا مسئلہ ہے" ڈرائیور نے کہا ! باختران کی سپاہ کے لئے اپنے ٹرک پر کچھ مال لایا ہوں اب یہ چاہتا ہوں کہ جلد از جلد اسے آپ لوگوں کے حوالے کر کے لوٹ جاؤں لیکن یہ لوگ کہتے ہیں کہ کل ہی حساب بے باک کریں گے۔ میرزا نے ٹیلیفون پر انبار کے ذمہ دار کو ہدایت دی کہ اس ٹرک ڈرائیور کو جلدی ہے اسکا ٹرک ابھی خالی کر کے اسکا حساب کر دیا جائے۔ اس کے بعد ڈرائیور سے مخاطب ہوئے اور کہا جاؤ خدا حافظ ڈرائیور سر جھکائے کھڑا تھا اسکی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں اچانک اسنے آگے بڑھ کر اپنے آپ کو میرزا کے قدموں پر گرا دیا۔ اب اسکی زبان پر مغلظات کے بجائے میرزا کے دعائیں تھیں

میرزا کردستان سے اس طرح جڑ گئے تھے کہ وہاں جو بھی مشکل در پیش آئی انہیں کی طرف رجوع کیا جاتا۔ وہ جانتے تھے کہ کردی عوام سے سب سے زیادہ ہمدردی میرزا کو ہے۔ لوگ اپنے گھریلو اور خصوصی مسائل بھی میرزا سے ہی حل کروانا چاہتے تھے، وہ محض سپاہ کے ایک ذمہ دار افسر نہ تھے بلکہ وہ تو کردستان کے ہر چھوٹے بڑے گھر کی ایک قابل اعتماد فرد تھے۔ صوبہ کے ہر طرح کے مسائل وہی حل کرتے۔ شہر سے لے کر دیہی علاقوں تک ہسپتال اور مدارس کا قیام حفظان صحت کے اصولوں کا اجرا، قومی طبّی امداد اسی طرح آباد کاری کے تمام مسائل حل کرنے میں سب سے آگے رہتے یہاں تک کہ لوگوں کی گھریلو ضروریات جیسے، آٹا، تیل، شکر، چاول اور گوشت وغیرہ کی تقسیم میں بھی دخالت رکھتے تھے۔ اپنا اچھا خاصا وقت صوبہ کی ترقی کے ذمہ دار لوگوں اور ریاست کے عہدہ داروں کے ساتھ میٹنگ پر خرچ کرتے صوبہ کے چھوٹے بڑے سبھی عہداہ

داران ان کے مفید مشوروں سے بہرہ مند ہوتے۔ ان تمام مشغولیات کے ساتھ ساتھ میرزا نے فوج، 'سپاہ' اور مسلح عوام کے بیچ باہمی تال میل سے ایک ایسے مضبوط لشکر کی بنا ڈالا جس سے صوبہ کو ضد انقلابیوں سے آزاد کرایا جاسکے۔ انہیں تہران واپس آکر "سپاہ" کی وزارت قبول کرنے کی پیش کش کی گئی لیکن انہوں نے اسے مسترد کرتے ہوئے کہا! میں ایک درزی کا شاگرد ہوں کہاں میں اور کہاں وزارت! میں کردستان آیا ہوں تاکہ یہاں کی مستضعف عوام کی خدمت کر سکوں۔

وہ لوگوں کی خدمت میں اس قدر تواضع اور انکساری سے کام لیتے کہ جب دوسروں کے ساتھ کسی کام کو کر رہے ہوتے تو یہ مشخص نہ ہو پاتا کہ کمانڈر اور سربراہ وہ ہیں یا کوئی اور؟ ایک رات مجبوراً ایک کیمپ پر رکنا پڑا آدھی رات میں جب سب سو رہے تھے تو ایک افسر کی آواز سنائی دی وہ کہہ رہا تھا یہاں کا چوکیدار کہاں گیا۔ سارے سپاہی کہاں ہیں کیا کوئی سپاہی یہاں پہرا نہیں دے سکتا؟ میرزا اطمینان کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھے اسلحہ اٹھایا اور باہر آکر سوال کیا کس جگہ پر نگہبانی کرنی ہے میں حاضر ہوں رات تاریک تھی افسر میرزا کو نہ پہچان سکا ہاتھ سے ایک طرف اشارہ کیا اور کہا خدا تمہارا بھالا کرے جاؤ دو گھنٹے بعد میں کسی دوسرے کو بھیج دوں گا۔ میرزا فوجی محاذ پر اسلحہ لئے ہوئے ریت بھری بوریوں کے پیچھے مستعدی کے ساتھ کھڑے ہوگئے۔ رات گزرتی رہی صبح کا وقت تھا کہ افسر نے آکر پوچھا ابھی تک کوئی تمہاری جگہ لینے نہیں آیا؟ میرزا نے جواب دیا کوئی بات نہیں میں یہیں نماز صبح پڑھ لوں گا جوانوں کو چھوڑو وہ آرام کر لیں۔ افسر کو بڑا تعجب ہوا اس قدر ایثار کرنے والا فوجی اب تک اسکی نگاہوں سے نہیں گزرا تھا، وہ بہت خوش ہوا اور لوٹ گیا۔ سورج طلوع ہونے پر افسر نے فیصلہ کیا کہ اب اس فوجی کی جگہ کسی

اور کو بھیج دیا جائے۔اس قصد کے تحت وہ میرزا کی طرف آنکلا اور جیسے ہی اسکی نظر میرزا پر پڑی۔ گویا اسکی روح نکل گئی ہو اپنی جگہ کھڑا میرزا کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ میرزا اس کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ میں مجبور ہوں کہ شہر واپس جاؤں ورنہ اگر ممکن ہوتا تو دو تین گھنٹے اور یہیں رہتا۔

میرزا ایسے ہی اعلیٰ ظرفیت کے مالک تھے۔جب اردوگاہ میں داخل ہوتے تو عام سپاہیوں کی طرح ان کی بھی تلاشی لی جاتی۔انہوں نے کبھی بھی خود کو علاقے کا فرمانروا ظاہر نہ کیا۔ وہ یہی چاہتے تھے کہ ایک معمولی سپاہی کے عنوان سے خدمت انجام دیتے رہیں اور دوسرے انہیں اسی حیثیت سے پہچانے ان کی شہادت کے بعد جب ان کی تصاویر شائع ہوئیں تب نہ جانے کتنے سپاہیوں نے جانا کہ ان کے ساتھ فٹبال، والی وال، کھیلنے والا، دوستانہ محفل میں لطیفہ سنا کر ہنسنے ہنسانے والا، مختلف تفریحی پروگرام میں انکا شریک، کوئی معمولی فوجی نہیں بلکہ سپاہ کا ایک بڑا افسر تھا، ایسا کمانڈر جس نے کردستان میں قیادت کے علاوہ بعثیوں سے جنگ میں اپنی عمر کا ایک حصہ مغربی سرحد پر گذارا ہے۔

میرزا 1961 تک باختران میں مقیم رہے۔لیکن کردستان کے تمام شہروں کی آزادی کے بعد ضد انقلابیوں سے روبرو ہونے کے لئے "سردشت" اور پیران شہر کے علاقوں کی طرف چلے گئے۔ان علاقوں میں حالات ابھی قابو میں نہیں آئے تھے۔زوجہ کے اصرار پر باختران سے "ارومیلہ" نقل مکان کر گئے۔ خاص طور پر آیۃ اللہ اشرفی اصفہانی کی شہادت کے بعد خود ان کے لئے باختران میں رکا رہنا کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔

شہید بروجردی کا وصیت نامہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(۱۔) یہ وصیت نامہ اس حالت میں لکھ رہاہوں کہ اگلے دن مجھے "سندج" جاناہے۔ میں نے متعدد فوجی مہموں میں شرکت کی ہے اور وصیت لکھنے کی ضرورت کو محسوس کرتا رہاہوں لیکن نہ وقت مل سکااور نہ ہی اس کو زیادہ اہمیت دی لیکن نہ جانے کیوں ایسالگ رہاہے کہ اگراب وصیت مرتب نہ کی توگناہ کا مرتکب ٹھہروں گا۔ لہٰذا اہل خاندان اور اعزا و اقارب کے لئے وصیت لکھ رہاہوں۔

(۲۔) میں تقریباً چھ برسوں سے سیاسی اور فوجی مہمات میں مشغول ہوں جسکی وجہ سے خاندان والوں خصوصاً اپنی بیوی اور بچوں پر توجہ نہ دے سکا، اسکے سبب ہمیشہ اضطراب محسوس کرتا رہاہوں اور کبھی بھی خود کو قانع نہ کر سکا کہ فوجی ذمہ داری کو ترک کردوں، اس سلسلہ میں ان سب سے معذرت خواہ ہوں اور ان سے اس بات کا متمنی ہوں کہ اپنے وہ تمام حقوق معاف کردیں جو میری گردن پر تھے اور میں انہیں ادا نہ کر سکا۔ لیکن ساتھ ہی میں اپنے خاندان والوں کو یہ اطمینان دلانا چاہتاہوں کہ میں انہیں کبھی نہیں بھولا۔ وہ ہرگز یہ نہ سوچیں کہ میں ان سے بے پرواہ رہاہو لیکن کیا کرتا میرے کندھوں پر اس سے زیادہ اہم ذمہ داریاں تھیں۔

اپنی زوجہ سے اس بات کا خواستگار کہ وہ بچوں کی بہترین تربیت کرے۔ اور انہیں اسلام کا خیر خواہ بنادے۔ اگرچہ میرے پاس کوئی ملکیت نہیں لیکن جو مال بھی ہے اس پر صرف میری زوجہ کا تصرف ہوگا۔

اپنے بھائی محمد اور عبداللہ سے درخواستگزار ہوں کہ ماں اور بہنوں کی دیکھ بھال کریں اور میری زوجہ کو صبر واستقامت کی تلقین کریں۔

سبھی لوگوں سے معافی کا طلبگار ہوں خصوصاً اپنی ماں سے جنہیں مجھ سے بہت اذیت پہونچی ہے۔ اور مجھے کبھی موقع نہ مل سکا کہ ان پر خاص توجہ دے سکوں اور تمام اعزاء واقارب سے جو مجھے پہچانتے ہیں درخواست کرتا ہوں کہ بارگاہ رب العزت میں میری مغفرت کے لئے دعا کریں۔ شاید مومنین کی دعاؤں کے صدقے میں خدا میری خطاؤں سے درگذر کرے۔ درحالیکہ میں اپنے کندھوں پر گناہوں کا بوجھ محسوس کرتا ہوں خاص طور پر ان سپاہیوں سے ملتمس دعا ہوں جو سرحد پر جان کی بازی لگائے ہوئے ہیں۔ اور ان تمام لوگوں سے جو میری زندگی سے کسی بھی عنوان سے جڑے ہوئے تھے اور کسی بھی مسئلہ میں مجھ سے ربط رکھ چکے تھے درخواست گزار ہوں کہ اگر مجھ سے ان کے حق میں ذرا بھی بدی سرزد ہوئی ہے تو اسے نظرانداز کردیں اور مجھے معاف فرمائیں۔ یا اگر کسی ایسے کو جانتے ہوں جسکا کوئی حق میری گردن پر باقی رہ گیا ہے تو اسے راضی کریں۔

دوسری بات یہ کہ "مزاحمت" کا دامن ہرگز نہ چھوڑیں کہ خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ خداوند عالم نے آج کے اس تاریخی عہد میں ایران کی مسلم عوام کو انقلاب اسلامی کی عظیم ذمہ داری سونپی ہے اور ہم کو عظیم امتحان میں ڈالا ہے۔ بہت سے شہیدوں نے خاص طور سے آخری کے چند برسوں میں یہ بات ایران میں مختلف دیواروں پر لکھی ہے۔ اگر ہم نے "مزاحمت" جاری نہ رکھی تو جیسا کہ امام خمینی نے فرمایا اس بات کا خوف ہے کہ شہداء کی زحمات رائیگاں ہو جائیں اگرچہ وہ سعادت ابدی پا چکے ہیں اور وہ ہم ہیں جو ابھی آزمائش سے گذر رہے ہیں۔

دوسری بات یہ کہ صدر اسلام سے جو ہمیں تجربہ حاصل ہوا ہے اس سے عبرت لینی چاہئے جہاں مسلمان جہالت کے سبب اسلام کی سیدھی راہ سے بھٹک گئے۔ لہٰذا اس "روح خدا" کی باتوں پر غور کرنا چاہئے جسکا راستہ خدا کے رسول کا راستہ ہے۔ آج امام راحل کا وجود ہمارے لئے مشعل راہ ہے۔ انکی راہ سعادت اور کامرانی کا راستہ ہے۔ جس سے انحراف دنیاو آخرت کا زیان ہے۔ میں اپنے پورے وجود سے اس بات کا معتقد ہوں کہ صدام اور امریکہ سے مقابلہ کرنے سے زیادہ اہم، حساس اور مشکل کام ایسی تحریکوں کی شناخت اور ان کا مقابلہ کرنا ہے جو مسلمانوں کے درمیاں افتراق ڈالنا اور انقلاب کو اسکے صحیح محور اور بنیادی راستہ سے ہٹادینا چاہتی ہیں۔

برادران سے میری وصیت ہے کہ کوشش کریں کہ عوام الناس کو جو یقینا انقلاب کی عاشق ہے اعتقادی اور سیاسی طور پر باشعور بنائیں تا کہ یہ لوگ "انقلاب" کے سچے خیر خواہوں کو پہچان سکیں اور اسی طرح منحرف تحریکوں کو پہچان کر ان سے دوری اختیار کر سکیں۔ یقیناً عوام کا بابصیرت ہونا انقلاب کو حیات عطا کرتا ہے۔

(۳۔) یہ میرا یعنی محمد بروجردی (پدر درہ گرگی) کا یہ وصیت نامہ ہے۔ خدا کی حمد و ثنا اور اس سے طلب مغفرت کے بعد کہ تمام چیزیں اسی کی طرف پلٹتی ہیں۔ محمد و آلِ محمدؐ پر درود ہو اور اس قوم کے امامؑ پر اسی طرح تاریخ کے تمام شہداء پر۔ تمام اعزاء و اقارب جن سے تمام عمر کسی بھی طرح رابطہ رہا ہے معافی کا طالب ہوں اور اس شخص سے جو اس وصیت کو پڑھے درخواستگوار ہوں کہ میرے لئے طلب مغفرت کرے۔ میں اس دنیا سے بے سر و سامان جا رہا ہوں میرے بعد میری زوجہ میرے گھر کی سرپرست ہو گی، میری تنخواہ اور جو تھوڑا بہت اثاثہ حیات چھوڑ رہا ہوں اسی کو

ملے سوائے "سات ہزار ریال"(سات سو تومان) کے جو ضروری ہے کہ وہ میری ماں کو دے۔ میری بیوی کے مر جانے کی صورت میں میرا چھوٹا بھائی عبداللہ محمد میرے دونوں بچوں کی ذمہ داری قبول کرے۔ اس بات پر ایک بار پھر سبھی سے معذرت چاہتا ہوں کہ اپنے خاندان کے لئے پوری طرح مثبت کردار ادا نہ کرسکا والسلام۔

آخری تحریر

اسلامی فوج کے (سردار) محمد بروجردی کی یہ آخری وصیت ہے جو انکی ڈائری میں لکھی پائی گئی

بسمہ تعالیٰ

یہ میرا (یعنی محمد بروجردی پدر درہ گرگی) وصیت نامہ ہے۔

تمام حمد و ثنا پروردگار عالم کے لئے ہے۔ اسکی بارگاہ میں طلب مغفرت کرتا ہوں کہ ہر ہستی کی بازگشت اسی کی جانب ہے۔ لاکھوں درود و سلام ہو محمد مصطفےٰؐ اور انکے پاک و پاکیزہ خاندان پر اور خدا کی رحمت ہو رہبر امت امام خمینی اور تمام شہدائے راہِ حق پر۔ میں ان تمام حضرات سے معافی کا طلبگار ہوں جن سے زندگی کے کسی موڑ پر کسی عنوان سے بھی میرا سابقہ رہا ہے۔ اسی طرح اس تحریر کے پڑھنے والے ہر شخص سے

ملتمس ہوں کہ میرے لئے طلب مغفرت کرے کیوں کہ میں اس دار فانی سے خالی ہاتھ جارہا ہوں۔ میرے بعد میری زوجہ میرے گھر کی سرپرست ہوگی (اور جو کچھ میں چھوڑے جارہا ہوں اسی کا ہوگا۔ سوائے سات ہزار ریال کے جو میری ماں کا رہے گا۔) اور میری بیوی کی موت کی صورت میں میرے چھوٹا بھائی عبدال۔۔۔کے کندھے پر میرے دونوں چھوٹے بچوں کی سرپرستی کی ذمہ داری ہوگی۔ اور اپنے خاندان کے لئے مثبت کردا ادانہ کر پانے کی بناءپر ان سب سے معذرت اور معافی کا طلبگار ہوں۔

خدارا ان بہتے ہوئے خون کا واسطہ ہمارے اس انقلاب کو اتنی لمبی عمر عنایت فرمائے کہ شہدا کا لایا ہوا یہ انقلاب امام مہدیؑ کے آخری انقلاب سے جا ملے۔

والسلام محمد بروجردی

پرواز، نقدہ کے تراہے سے

میرزا کردستان کو آزاد کرا سکیں اس کے لئے برسوں درکار تھے۔ یہ وقت گذرا اور میرزا کو کامیابی حاصل ہوئی جی جان سے کئے گئے اقدامات بارآور ثابت ہوئے کردستان آزاد ہو گیا۔ تاریخ گواہ ہے کہ میرزا کے آس پاس عظیم شخصیتیں پروان چڑھی ایسی شخصیتیں جنہوں نے پورے ملک میں شہرت پائی اور پوری دنیا میں اپنی عظمت کا جھنڈا گاڑا۔ میرزا کے دیرینہ کردستانی رفیق شہید ناصر کاظمی، شہید ہمت، شہید طیارہ، احمد

متوسلیان اسی طرح کے متعدد فوجی افسران جنھوں نے میرزا کے دوش بہ دوش کردستان کے لئے اپنا خون پسینہ ایک کر دیا اور شجاعت و جوانمردی کے ساتھ دلوں پر حکومت کرنے کا بے مثال نمونہ پیش کیا یہ وہ جوانمرد سپاہی تھے جنھوں نے دشمنوں سے بھی اپنی شجاعت و دلیری کا لوہا منوالیا۔

میرزا نے اپنے ہونٹوں پر اپنی بے داغ ضمیر کی عکاس مسکراہٹ سے کردستان جیسے ناامن علاقے میں اسلام اور انقلاب کی حاکمیت قائم کردی۔ لیکن اب قدرت کو میرزا کی دلی تمنا پوری کرنی تھی جو مدتوں سے میرزا کے سینے میں کروٹیں لے رہی تھی جسکے لئے وہ رات رات بھر مصلئے عبادت پر دعائیں مانگا کرتے تھے۔ وہ میرزا کی آخری امتحان تھا۔ جنگی محاذ پر بہت سے دوست انہیں سلام آخر کر چکے تھے۔ کیونکہ ہر سپاہی کا بہترین اجر وہ جنت ہے جو جام شہادت پینے کے بعد اسے عطا ہوتی ہے۔ میرزا متعدد دفعہ بڑے بڑے خطروں سے بچ نکلے تھے۔ مصلحت الٰہی یہی تھی کہ ابھی زندہ رہیں لیکن 1987 خدا نے یہ ارادہ کرلیا کہ اپنے باغ خلقت کے اس نادر پھول کو حیات ابدی سے مالا مال کردے ایسا گل جو بے چین آنکھوں کو رہتی دنیا تک سکون بخشتا رہے جسکی خوشبو تا ابد مشام انسانی کو معطر کرتی رہے جسکا رنگ صبغۃ الٰہی کا پیغامبر رہے۔ میرزا کی ہجرت کا وقت آگیا تھا۔ اکثراوقات تنہائی میں گزارنے لگے تھے آنکھیں گہری سوچ میں ڈوبی رہتیں۔ اب ہمیشہ لبوں پر رقصاں رہنے والی مسکراہٹ کوئی اور راز بھی کہتی تھی۔ غروب کے وقت مغرب کو رخ کر کے بیٹھ جاتے اور پوری دنیا کو اجالا دینے والے سورج کو بجھتا دیکھتے رہتے۔ بے تکلف بیٹھکیں تقریباً ختم ہوگئی تھیں۔ ان پر عجیب سی اضطرابی کیفیت طاری رہتی تھی جیسے انھیں کسی محبوب کا بے چینی سے انتظار ہو۔ ان کی اہلیہ اور بچے کسی عزیز سے ملنے تہران

گئے ہوئے تھے، انہوں نے ایک شام تہران فون کیا اور اپنے بھائی سے کہنے لگے اگر تم لوگ مجھ سے ملاقات کرنا چاہتے تو اب ارومیہ لوٹ آؤ مجھے ایک لمبا سفر درپیش ہے۔ وہ سب اگلے ہی دن ارومیہ واپس آ گئے اور اگلے صبح تک ان کے ساتھ رہے۔

اگلی صبح شہدا ریجمنٹ کے ساتھ ایک خاص میٹنگ تھی۔ جس میں یہ طے پانا تھا کہ ریجمنٹ کے لئے نیا فوجی کیمپ کہاں قائم کیا جائے۔ میٹنگ بہت دیر تک چلتی رہی۔ اگلے دن طلوع آفتاب کے وقت اپنے ڈرائیور سے مخاطب ہوئے اور کہا "احمد تم آج مہاباد چلے جاؤ" احمد نے تعجب کے ساتھ پوچھا کیوں؟ میرزا نے جواب دیا۔ بس کہہ دیا مہاباد جاؤ! ڈرائیور جو ایک مدت سے ان کے ساتھ تھا پہلی مرتبہ انہیں ایسے سخت لہجہ میں بات کرتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ بولا مجھے مہاباد میں کوئی کام نہیں کیوں جاؤں وہاں؟ میرزا کے چہرہ پر گہرے تفکرات کے آثار نمایاں تھے وہ پہلے ہی جیسے انداز میں بولے۔ نہیں تم آج اس سفر میں ہم لوگوں کے ساتھ ہر گز نہ ہوگے۔ آج میں ایک دوسرے رستے سے جانے والا ہوں۔ احمد کے سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا وہ چھ ماہ سے انکا ڈرائیور تھا، ان کی تمام عادات واطوار، نیک کردار اور خوش گفتاری سے آشنا تھا۔ ان کے آنے جانے کے مقامات اور راستوں سے بھی اچھی طرح آگاہ تھا۔ بارہا ان کے ساتھ اپنا درد دل بیان کر چکا تھا یہاں تک کہ اپنے خاندانی مسائل بھی میرزا کے سامنے بیان کرتا۔ بعض اوقات وہ میرزا سے بحث بھی کرنے لگتا اور میرزا ٹھنڈے دل سے اسکی ساری باتیں سنتے۔ نہ جانے کتنے لمبے سفروں پر میرزا کی گاڑی اسی نے ڈرائیو کی تھی پورے راستہ بھر ایک دوسرے سے دوستانہ لہجہ میں باتیں ہوتیں۔ میرزا کو بھی احمد کے ساتھ کی عادت پڑ گئی تھی۔ گویا دونوں نے ایک دوسرے کو اپنا ہمدرد پایا تھا ایسے میں ہر انسان اپنے ہمدرد سے محبت کرنے لگتا ہے۔ اور آج صبح جب میرزا نے

احمد سے کہا تم میرے ساتھ نہیں جاؤ گے بلکہ مہاباد چلے جاؤ تو احمد کے تعجب کا ٹھکانہ نہ رہا۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا میرزا کبھی تنہا نہیں جاتے تھے۔ لیکن صرف یہی بات احمد کے تعجب کا باعث نہ تھی بلکہ خاندان والوں کو وقت معینہ سے پہلے ہی واپس بلا لینا کاموں کے وقت میں بدلاؤ۔اسی طرح انداز گفتگو میں بدلاؤ اور ساتھ ہی آج کل جو مختلف قسم کے کام وہ انجام دے رہے تھے سب نے احمد کو حیران وپریشان کرر کھا تھا۔

میرزا کے آج ساتھ چلنے سے منع کرنے اور مہاباد چلے جانے کے حکم کے بعد بھی احمد نے اگلی نشست پر بیٹھ کر اسٹیرنگ سنبھال لی اور میرزا کا انتظار کرنے لگے۔ جب میرزا نے احمد کو اس حال میں دیکھا تو وہ متحیر رہ گئے انہیں امید نہیں تھی کہ احمد ان کی بات نہ مانے گا اور گاڑی میں آبیٹھے گا۔انہوں نے دوبارہ اصرار کیا کہ احمد مہاباد چلا جائے لیکن پھر خاموشی سے احمد کی لگاتار مخالفت کے سامنے سپر ڈال دی کچھ نہ کہا اور بایاں دروازہ کھول کے گاڑی میں بیٹھ گئے۔ میرزا کے ساتھ پانچ لوگ اور تھے یہ لوگ نئے کیمپ لگنے کی جگہ کا معائنہ کرنے جارہے تھے۔ راستہ بہت طولانی تھا سب تھک چکے تھے کہ احمد نے اپنے خراب اقتصادی حالات کا شکوہ کرنا شروع کردیا۔ اس پر میرزا نے امام حسین کی مصیبتوں کا حوالہ دیتے ہوئے کہا: صرف ہم اور تم مشکلوں سے نہیں گھرے ہوئے ہیں ہم لوگوں کو صبر واستقامت سے کام لینا چاہئے مصیبتوں کے آگے گھٹنے نہیں ٹیکنے چاہئے۔ میرزا اسی طرح احمد کو سمجھاتے رہے یہاں تک کہ وہ لوگ "نقدہ" کے تراہے پر پہنچ گئے۔ اب وہ مقررہ منزل سے نزدیک ہورہے تھے کہ اچانک میرزا احمد کی طرف گھومے اور سخت لہجہ میں احمد سے کہا! گاڑی سے فوراً اتر جاؤ احمد نے تعجب سے پوچھا کیوں؟ میرزا نے پھر تند لہجہ اختیار کرتے ہوئے اس سے کہا کہ جاؤ اور جو گاڑی پیچھے آرہی ہے اس میں بیٹھو۔

احمد نے اعتراض کرتے ہوئے پوچھا! آخر کیوں؟ کیوں میں کسی دوسری گاڑی سے آؤں کیا میں نے کوئی غلط بات کہہ دی ہے۔ میرزا نے تعجب سے پھیلی ہوئی احمد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا آج تم کو ہم لوگوں کے ساتھ نہیں جانا ہے۔ اس بات کو تم بعد میں خود ہی سمجھ جاؤ گے۔ احمد حیرانی کے عالم میں بادل ناخواستہ میرزا کی گاڑی سے اتر کر پچھلی گاڑی کی طرف چل پڑا وہ بہت فکر مند تھا میرزا کا یہ رویہ اس کے لئے بالکل نیا تھا۔ پچھلے کچھ دنوں سے میرزا کے یہ نئے انداز اس کی سمجھ سے باہر تھے۔ میرزا کی گاڑی یہاں کچے راستے پر اتر گئی تھی۔ ان کی گاڑی سب سے آگے چل رہی تھی۔ یہ قافلہ ابھی کچے راستے پر کچھ ہی دور چلا تھا کہ ایک زوردار دھماکہ کی آواز نے سب کو دہلا دیا۔ دھویں اور گرد و غبار کے باعث کسی کو کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ سب گاڑیوں سے اتر کر وہاں پہونچے میرزا کی گاڑی الٹ گئی تھی میرزا اور ان کی ساتھی خون میں لت پت گاڑی کے چاروں طرف پڑے ہوئے تھے۔ احمد دوڑتا ہوا میرزا کے پاس پہنچا اور ان کے سینے پر اپنا سر رکھ دیا۔ میرزا کی سانسیں بند ہو چکی تھیں۔ احمد زمین پر بیٹھ گیا۔ وہ آنکھوں پر پڑے آنسوؤں کے پردے کے عقب سے میرزا کی خون میں ڈوبی ہوئی لاش کو دیکھ رہا تھا۔ لمحے بھر میں میرزا کی باتوں کا مطلب اسکی سمجھ میں آچکا تھا۔

اس طرح اس کی زندگی کا خاتمہ ہوا جس نے اپنی تمام عمر خدا کی راہ میں صرف کی تھی۔ اس کے بعد کردستان میں نہ جانے کتنے والدین نے اپنے بچوں کا نام "میرزا" رکھا تاکہ وہ میرزا برو جردی کی مہربانیوں کو ہمیشہ یاد رکھ سکیں۔ اور جس سے میرزا کی ایثار و قربانی عزم و استقلال اور شجاعت و جوانمردی کی عظیم یادیں آنے والی نسلوں کے سینے میں دل بن کے ڈھڑکتی رہیں۔